نعوذ باللہ تعالیٰ و جل شانہٗ

انتخابِ زرّیں

مرتبہ

سر سید راس مسعود بی۔ اے (آکسفورڈ) پی۔ ایچ۔ ڈی

المخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر

بار پنجم

۱۹۵۲ء

طباعت بار اول ۱۹۲۱ء

طباعت بار دوم ۱۹۲۶ء

طباعت بار سویم ۱۹۳۶ء

طباعت بار چہارم ۱۹۵۱ء

طباعت بار پنجم ۱۹۵۲ء

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

محمد احیاء الدین پرنٹر و پبلشر

ملنے کا پتہ

نظامی بک ایجنسی بدایوں یو۔پی

انتخاب زریں

طبع چہارم

انتخاب زریں کی مقبولیت کا پتہ اس سے چلتا ہی کہ آج ہم اس کا چوتھا ایڈیشن اس زمانے میں شایع کر رہے ہیں جبکہ اُردو کس مپرسی کی حالت میں کہی جاتی ہی۔ کاغذ اور طباعت کی گرانی کی حد ہو چکی ہی مگر کتاب کی مقبولیت اور اُس کی مانگ نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم باوجود تمام دقتوں کے اس کا چوتھا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں تک پہونچا رہے ہیں اس سال حکومت کشمیر نے اس کتاب کو انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں داخل کر کے ہماری جو حوصلہ افزائی کی ہی اس کے لئے ہم مشکور ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ اگر اس کتاب کی مانگ اسی طرح باقی رہی تو ہمیں بہت جلد اس کا پانچواں ایڈیشن شایع کرنا پڑے گا اس جدید الطبع نسخہ کی اشاعت میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی ہی بلکہ اکثر شعراء جو طبع سوم کے وقت زندہ تھے آج اس دار فانی سے کوچ

کر چکے ہیں ان شعراء کا حال اور کلام جس ترتیب سے دیا گیا ہے۔ وہی ترتیب اس نسخہ میں قایم رکھی گئی ہے صرف ناظرین کی آگاہی کے لئے شاعر کے نمونۂ کلام سے پہلے سال رحلت لکھ دیا ہے۔

احمد الدین نظامی بدایونی

بدایوں - ۱۵؍ جنوری ۱۹۵۱ء

طبع سوم

سر سید راس مسعود بالقابہ نے سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں جبکہ
وہ سرکار آصفیہ میں ناظم تعلیمات کے فرائض ادا کر رہے تھے اُردو ادب
کے ان جواہر ریزوں کو ایک تاریخی سلسلہ میں منسلک کر کے ملک کے سامنے
پیش کیا تھا۔ ان کا یہ انتخاب فی الواقع انتخاب زرّیں ثابت ہوا۔ دنیائے
ادب نے اس کو نہایت عزّت کی نظر سے دیکھا۔ آج اس کا یہ تیسرا نسخہ
ناظرین کرام کے ہاتھوں تک پہونچتا ہی۔ اس جدید الطبع نسخہ کی اشاعت
کے وقت اکثر شعرا جو طبع اوّل کے وقت زندہ تھے آج اس دار فانی سے
کوچ کر چکے ہیں لیکن اصل نسخہ میں ان کا کلام جس ترتیب سے دیا گیا ہی
وہی ترتیب اس نسخہ میں بھی قایم رکھی گئی ہے صرف ناظرین کی آگاہی
کیلیے ہم نے شاعر متوفی کا سال رحلت لکھ دیا ہی۔ اس بے مثل انتخاب کی قبولیت

کی اصل وجہ یہ ہی کہ اس میں ایسے اشعار کے انتخاب سے احتراز کیا گیا ہو کہ جو سنجیدگی اور متانت کے درجہ سے گرے ہوئے ہوں زہرِ عشق اور مثنوی طلسمِ اُلفت کے اشعار بھی اگر انتخاب ہوئے ہیں تو ان میں ہوسناکی کی داستان اور بازاری بولی ٹھٹھولی کا پہلو نظر نہیں آتا۔

اس انتخاب کو مرتب ہوئے سولہ سال گزر چکے ہیں اس مدت میں اردو شاعری میں انقلاب عظیم ہو چکا ہے اور اردو ادب نئے نئے شاعروں کے کلام سے روشناس ہو چکا ہے مثلاً جوشؔ ملیح آبادی اور جگرؔ مراد آبادی کے کلام کا آج کل بہت کچھ چرچا ہے ناظرین انتخاب ہذٰا کے صفحات ان شعراء کے کلام سے خالی پائیں گے اس کی وجہ ظاہر ہی کہ جس وقت یہ تذکرہ مرتب ہوا تھا ان کے کلام کی وہ شہرت نہ ہوئی تھی جو آج ہے۔

یہ امر مسلمہ ہی کہ ہر قوم کے اندر ایک روح ہوتی ہے اور ہر قوم کی فطرت ایک مخصوص قانون کی پابند ہوتی ہی جس سے اس کے ارتقا کی منزلوں کا تعین ہوتا ہے، شاعر اسی قومی ارتقا اور فطرت کے قوانین سے متاثر ہو کر قومی جذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے اس اجمال کی تفصیل حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے نمونۂ کلام سے بخوبی واضح ہو جاتی ہی۔ آپ فرماتے ہیں ؎

اُٹھ اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر
نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر

نئے اصول جزا و سزا کی دے تعلیم
نیا تخیّل روزِ شمار پیدا کر

غلط ہے سازِ عجم ہو کہ لحنِ اعرابی
نیا ترانہ سرِ شاخسار پیدا کر

بہت بلند ہے سطحِ مذاقِ فکرِ جدید
نظر میں اوجِ سپہر کو ہموار پیدا کر

کلاہِ خواجگی کا میابلہ کج کر کے
نیا زمانہ نیا روزگار پیدا کر

بہار میں تو زمیں سے بہار اُٹھتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

مذاقِ بندگیٔ عصرِ نو کی تجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

جگر مرادآبادی کا رنگ اس سے بالکل مختلف ہے ان کی شاعری غزل ہی تک محدود رہی ہے دیگر اصنافِ سخن میں اُنھوں نے شاذ و نادر ہی قدم رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ سیاسیات اور قومیات میں اُن کی نظموں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے ہم نمونہ کے طور سے انکی ایک غزل کا انتخاب اس موقع پر پیش کرتے ہیں۔

بے نقاب آج جو یوں جلوۂ جاناں ہو جائے
جو جہاں پر ہو وہیں بیخود و حیراں ہو جائے

ایک ذرّہ کا اگر حُسن نمایاں ہو جائے
آدمی شدّتِ انوار سے حیراں ہو جائے

حسن خود ہو نگراں عشق جو حیراں ہو جائے
جان خود جسم بنے جسم اگر جاں ہو جائے

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انسان کی ہے معراج جو انساں ہو جائے

خام سمجھو طلبِ شوق کا اعجاز جگر
ہر نفس عشق میں جبتک رگِ جاں ہو جائے

اس تمہید میں ان دو نئے شاعروں کے کلام کا نمونہ پیش کرنے سے میری صرف یہ غرض ہے کہ ناظرین پر ظاہر ہو جائے کہ ہماری زبان کی شاعری ارتقاء کی منزل میں ہے اور گزشتہ سولہ برس میں اس میں کیا کیا انقلاب رونما ہوئے ڈاکٹر اقبالؔ اور فانیؔ وغیرہ کے کلام کے انتخابات جو انتخاب رہیں کے قابل مولف نے اپنے تذکرہ کی پہلی ترتیب کے وقت زیب قلم فرمائے ہیں وہ بھی آج پرانے ہو چکے ہیں۔ اگر ان شعراء کے تازہ کلام پر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی کچھ نہ کچھ فرق نمایاں نظر آئے گا جس سے یہ صریح نتیجہ نکلتا ہے کہ آج کل ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی میں جو انقلابات ہو رہے ہیں ہماری شاعری بھی اس سے متاثر نظر آتی ہے کیونکہ جس طرح ہر انسان کی طبیعت جدت پسند واقع ہوئی ہے شاعر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے قدیم شعرا کا کلام بے مصرف ہو گیا ہے۔ یا ہمارا ادب اس سے بے نیاز ہو چکا ہے نہیں ہرگز نہیں۔ غالبؔ۔ ذوقؔ۔ انیسؔ۔ دبیرؔ۔ نظیرؔ۔ داغؔ کا کلام آج بھی وہی مزا دیتا ہے جو نصف صدی قبل دیتا تھا۔ ان سے پہلے کے شعراء میں میرؔ۔ دردؔ۔ سوداؔ سوزؔ۔ انشاؔ۔ مصحفیؔ کے کلام کے مشہور نشتر آج بھی سننے والے کو اسی طرح بے چین کر دیتے ہیں جس طرح آج سے سو برس پہلے وہ دل میں جا کر چبھ جاتے تھے۔ یہ چھوٹا سا تذکرہ انہیں جواہر ریزوں کا حامل ہے جن سے ہمارے نوجوان اور ہماری آیندہ نسلیں ہمیشہ مستفید ہوتی رہیں گی۔

خاکسار **نظامی** بدایونی

۔۔ اپریل سنہ ۱۹۲۷ء

تمہید

کسی قوم کی تہذیب و تمدن کے اندازہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کے سرمایۂ نظم کا مطالعہ کیا جائے۔

چند سالہائے گزشتہ سے میں یہ ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ ایک ایسا انتخاب شایع کروں جس پر ایک نظر ڈالنے سے میرے ہم وطن دوستوں کو اُردو نظم کے بہترین حصّہ کا لطف حاصل ہو جائے۔

یہ مجموعہ "انتخاب زرّیں" کے نام سے جو آج پیش کیا جاتا ہے نہ صرف ناظرین کے تفنن طبع کا سبب ہوگا۔ بلکہ اُن لوگوں کو جو اُردو نظم کی خوبیوں کے ایک گونہ منکر ہیں ثابت کر دیگا کہ وہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے اور اس کے

مطالعہ سے ظاہر ہو جائے گا کہ اگر اردو شاعری کے بہترین حصہ کا کسی دوسری قوم کی اچھی سے اچھی نظم سے مقابلہ کیا جائے تو اول الذکر کا درجہ گرا ہوا نہ رہے گا۔ درحقیقت جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ اُردو وہ زبان ہے جس کا شمار زمانہ حال کی نوزائیدہ زبانوں میں ہے تو یہ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر قلیل مدت میں اُردو نظم کو وہ جِلا دے دی گئی جو مہذب اور شستہ خیالات کے لئے سہل الاصول ہے۔

صرف ایک ذات واحد کا کیا ہوا انتخاب اُسی وقت ہر شخص کے مذاق کے مناسب ہو سکتا ہے جبکہ مولف کو قدرت سے ذہانت کا کافی حصہ ملا ہو (بدقسمتی سے میں اس سے کوسوں دور ہوں) جو اصول میں نے اس انتخاب میں مدِنظر رکھا ہے وہ نہایت سادہ ہے میں نہ شاعر ہوں نہ فن سخن کا نقاد کامل لیکن مجھے اپنی قوم کے فن شعر کے ساتھ سچا عشق ضرور ہے میں نے وہی کلام انتخاب کیا ہے جس کو میرے دل نے پسند کیا۔ جن اشعار نے مجھ پر گہرا اثر کیا انھیں کو میں نے اس تذکرہ میں لیا ہے اور جن اشعار سے صرف عارضی اور فوری ولولہ پیدا ہوتا تھا ان کو ترک کر دیا خلاصہ یہ کہ میرا قلب ہی اس معاملہ میں میرا رہنما تھا پس اگر ناظرین کو اس انتخاب میں کوئی سقم نظر آئے تو وہ اسے اُردو نظم کا نقص نہ خیال کریں بلکہ فی الواقع وہ اس کو میرے مذاق کی کمی سمجھیں۔

میں اس موقع پر اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مجموعہ بالخصوص ان اصحاب کے لئے کیا گیا ہے جو میری طرح اس نئی روح پر جو ہماری شاعری

ہیں کچھ نئی جا رہی ہی نگاہ رکھتے ہیں اور قدیم طرز کے خیالات کے شیدائی نہیں ہیں
یہی وجہ ہی کہ بہت سی مشہور غزلوں کو جن میں وہ خیالی مضامین نظم کیے گئے ہیں
جو ایک زمانہ میں ہماری پُرانی شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے۔ (لیکن افسوس!
کہ موجودہ زمانہ میں ان کا ہمارے جذبات پر کچھ اثر نہیں ہوتا) انتخاب کرنے میں
جگہ نہیں دی گئی ہی۔

اس وقت تک اردو نظم کے جس قدر انتخاب میری نظر سے گذرے ہیں
اُن سب میں میرے معزز دوست مسٹر الیاس برنی پروفیسر معاشیات عثمانیہ
یونیورسٹی کے انتخاب جو حال ہی میں شائع ہوئے ہیں بلا شبہ بہترین ہیں۔ اُنھوں
نے ہر مضمون کی نظموں کو جداگانہ حصوں میں ترتیب دینے کی جو تکلیف اُٹھائی
ہو میں کافی طور سے اس کی داد نہیں دے سکتا۔ انکی یہ کوشش جاری ہی
اور وہ وقتاً فوقتاً اس کی اور جلدیں شائع کریں گے اس کے مقابلہ میں اس
مجموعہ کے پیش کرنے سے متعلق میری حقیر کوشش کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور
نہ وہ آئندہ جاری رہنے والی ہی میں نے شعرا کا مختصر حال اور اُن کا کلام
اُن کے زمانہ کی ترتیب کے لحاظ سے دیا ہی یعنی متوفی شاعروں کو ان
کی سن وفات کی ترتیب سے اور اپنے زمانے کے زندہ شعرا کو ان کی سال
پیدائش کے لحاظ سے درج کیا ہی۔ اگر میرے وہ دوست جو مجھ سے کچھ واقفیت
رکھتے ہیں اس رسالہ کو مطالعہ کرنے کے بعد مجھ سے اور زیادہ خصوصیت کیساتھ

واقف ہوجائیں گے۔ تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری محنت پورے طور سے وصول ہوگئی

خاکسار

سیّد راس مسعود

حیدرآباد دکن

۶ راگست ۱۹۲۱ء

فہرست شعراء

اس فہرست میں ہر شاعر کو بہ ترتیب حروف ابجی درج کیا گیا ہی اور نمبر صفحہ جس پہ اس شاعر کا کلام ملتا ہی اس کے محاذ میں لکھدیا ہی

ب



سید راس مسعود المخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصہ اوّل

(۱) ولی دکنی سنہ ۱۷۴۲ء

ولی محمد یا ولی اللہ نام تھا بعض تذکرہ نویسوں نے ان کا نام شمس الدین لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی ولادت اور وفات کے سال میں اختلاف ہے۔ بقول صاحب تذکرہ شعرائے دکن ولادت سنہ ۱۰۵۳ھ مطابق سنہ ۱۶۴۳ء اور وفات سنہ ۱۱۵۵ھ مطابق سنہ ۱۷۴۲ء میں ہوئی یہی تاریخیں قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ ولی کا مولد اورنگ آباد (دکن) تھا اسی وجہ سے وہ دکنی مشہور رہیں۔ وفات احمد آباد گجرات میں ہوئی۔ ولی کو اردو شاعری کا "باوا آدم" کہا جاتا ہے اگرچہ اردو زبان میں ردیف و قافیہ کے التزام کے ساتھ غزل سرائی کرنے والے شاعر ان سے پہلے بھی گزرے ہیں

ولی کے وقت سے ہمارے زمانے کی اُردو میں نمایاں فرق ہو گیا ہے اور ان کے دیوان کو موجودہ اُردو ادب میں قدیم اُردو کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے لیکن آج بھی باوجود صدیاں گزر جانے کے بعض بعض اشعار ان کے دیوان میں بہت صاف ملتے ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں ؎

مُفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ولی کا دیوان مختلف مطابع میں چھپ چکا ہے لیکن اب کمیاب ہے اس کا ایک اڈیشن پیرس میں نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا تھا جس کا دیباچہ فرانسیسی زبان میں مسٹر جے ہیل گریین ماسی نے لکھا ہے۔ اس کے بعد حضرت احسن مارہروی کا مرتبہ دیوانِ ولی مع فرہنگ ۱۹۲۷ء میں انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے جو نظامی بک ایجنسی بدایوں سے بھی مل سکتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

(۱)

دل طلبگار نازِ مہوش ہے — لطف اس کا اگرچہ دلکش ہے

مجھ سوں کیونکر ملیگا حیران ہوں — شوخ ہے بے وفا ہے سرکش ہے

کیا تری زلف کیا تری ابرو — ہر طرف سوں مجھے کشاکش ہے

تجھ بنا ای داغِ عشق سینہ و دل — چمنِ لالہ دشتِ آتش ہے

ای ولی تجربہ سوں پایا ہوں
شعلۂ آہ شوقِ بے غش ہے

(۲)

حُسن تیرا ہمہ رج پہ فاضل ہے	مُکھ تیرا رشکِ ماہِ کامل ہے
رات دن تجھ جمال روشن کوں	فضلِ پروردگار شامل ہے
جس کوں تجھ حُسن کی نہیں ہے خبر	بے گماں دو جہاں میں غافل ہے
عشق کی راہ کے مسافر کوں	ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

اے ولی طرز عشق آساں نہیں
آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

(۳)

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو
کب لگ رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو
گر دیکھنا ہے مدعا اُس شاہدِ معنی کا تو
ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار ہو بیزار ہو
جیوں چترِ داغِ عشق کوں رکھ سر پہ اپنے اولاً
تب فوجِ اہلِ درد کا سردار ہو سردار ہو
وہ نورِ چشمِ عاشقاں ہے جیوں سحر جگ میں عیاں
اے دیدہ وقتِ خواب نیں بیدار ہو بیدار ہو
مطلع کا مصرعہ اے ولی وردِ زباں کر رات دن

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو

(۴)

مفلسی سب بہار کھوتی ہے	مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیوں کہ حاصل ہو مجھ کوں جمعیت	زلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب	مجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے
کیوں کہ ملنا صنم کا ترک کروں	دلبری اختیار کھوتی ہے

اے ولی آب اُس پری رو کی
مجھ سنے دل کا غبار کھوتی ہے

(۲) سودا ۱۷۸۱ء

میرزا محمد رفیع نام ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء میں بمقام دہلی ولادت ہوئی۔ ان کے بزرگ تجارت کرنے کے لئے کابل سے ہندوستان میں آئے تھے اور اسی رعایت سے انھوں نے سودا تخلص اختیار کیا تھا۔ شاہ حاتم کے تلامذہ میں نامور اور اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ حضرت میر کے ہمعصر تھے انھوں نے نعمائے کے لحاظ سے اردو کو فارسی کا ہم پلہ بنا دیا تھا تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے خصوصاً ہجو گوئی میں کمال حاصل تھا جب دہلی اجڑ کر لکھنؤ آباد ہوا تو دیگر اہل کمال کے ساتھ شعرا میں سب سے پہلے میرزا صاحب لکھنؤ کو منتقل ہوئے اور وہاں باعمر ۷۰ سال مطابق ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا

ان کی کلیات کو ١٣٠٩ھ میں حکیم سید اصلح الدین خاں نے مرتب کیا تھا جو ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

غزل (۵)

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

جلے ہے شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے
کہیں ہے مہر بھی جا کہیں وفا بھی ہے

زبان شکوہ سوا اب نہ لانے میں ہیہات
کوئی کسی سے بہم دیگر آشنا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد
چمن چمن ہے بلبل کی اب نوا بھی ہے

(۶)

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا
پانی بھی پھر پئیں تو مزہ ہے شراب کا

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

غافل غضب ہے تنکے کہ جو یہ نہ رکھ نظر
ہے ہے شرار برق سے دامن سحاب کا

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم سے
دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا

اے برق کس طرح سے مرے جی جلاتی ہے تجھ
نقشہ ہے کیسا دل کے مرے اضطراب کا

زاہد سمجھ نہ نعمت حق جو ہے اکل و شرب
لیکن عجب مزہ ہے شراب کباب کا

سو آنکھ ہو دیدہ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا

(۷)

جوں غنچہ تو چمن میں بند قبا کو کھولے — پھر گُل سے اے پیارے بلبل کبھو نہ بولے
آوے گا وہ چمن میں ٹک ہی مگر کسی کو — شبنم سے کہا ہے بلبل بہ پائے الٹا کے جھولے
باغِ جہاں میں آ کر کچھ ہم نے پھل نہ پایا — اک دل ملا کہ جس میں ہیں سیکڑوں پھپھولے
ایسا ہی جانوں جاؤں سمجھے ہے تو سدھاؤ — اس دل پہ کل جو ہوتی سو آج ہی وہ ہو لے
کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اتنا — منہ چاہیں یہ چشمِ عاشق تو کبھی وہ نہ کھولے
یہ چشمِ تر اب ہالوں میں جیسے بتہ حبابی — کر رُک رُک کے پڑ گئے ہیں چھالی ہیں سب پھپھولے

کون ایسا ایسا ہے سودا گلی میں اس کی
آ بیٹھ کے جلیں ہم دل کھول کر تو رو لے

(۸)

نے بلبلِ چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں — میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں
گریاں بہ شکلِ شیشہ و خنداں بہ طرزِ جام — اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں
کوئی جو پوچھتا ہو یہ کس پر ہے داد خواہ — جیوں گل ہزار جا سے گریباں دریدہ ہوں
تیغِ نگاہِ چشم کا تیرے نہیں حریف — ظالم میں قطرہ قطرہ مژہ خوں چکیدہ ہوں
کس سے کروں میں دعویٰ دل جا کے اے خدا — وابستۂ زلف ہوں رخِ دلبر ندیدہ ہوں
کرتا ہے جا کے گل کی تسلی چمن میں تو — خونِ جگر میں ہی تو دامن کشیدہ ہوں
غافل ہے کیوں مرا بھی فرصت ہو گوشِ دل — اے بے خبر میں نالۂ حلقِ بریدہ ہوں

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقول درد
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

(۹)

خانہ پروردہ چمن ہیں آخر اے صیاد ہم
خانۂ گل سے ہمارا قریۂ بلبل ہے استاد ہم
خاکساروں سے اُٹھا نسبت ہمیں بنیاد ہم
ذبح تو کرتا ہے لیکن فرصت گلے لگنے کی دے
قیس جس دن سے گیا لیکن اُٹھا ہے کچھ قفس
کب نکل سکتے اسیر کیفیت تیرا اے ہمرو

اتنی رخصت دے کہ ہولیں گل کے ہمراہ آزاد ہم
اس چمن سے آہ جا کر کیا کہیں گے یاد ہم
راہ میں تیری گئے رہ بن نقش پا برباد ہم
عید قرباں ہے تجھے دے لیں مبارکباد ہم
خانۂ زنجیر رکھتے ہیں سدا آباد ہم
طوق قمری کی طرح رکھتے ہیں مادر زاد ہم

اے جنوں مصرعہ تیرا سودا کا ہے زنجیر پا
قید سے تیری کہاں ہونے کے اب آزاد ہم

(۱۳) خواجہ میر درد ۱۷۸۵ء

خواجہ صاحب میر درد اپنی غزلوں میں تصوف اور معرفت کے پاکیزہ مضامین نظم فرماتے تھے اکثر چھوٹی چھوٹی بحروں میں طبع آزمائی کرتے تھے کلام میں سنجیدگی اور متانت کا لحاظ رکھتے تھے فارسی کے عارفانہ خیالات کو اردو زبان کا لباس پہنانے میں انھوں نے جو صفائی اور سادگی برتی ہے وہ ان کے اردو دیوان سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے

دہلی کے اُجڑ جانے پر اکثر شریف خاندانوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہنی شروع کر دی تھی مگر توکل اور قناعت نے انہیں دہلی سے باہر نہ جانے دیا اور اپنے سجادے پر بیٹھے رہے خواجہ صاحب نے ۲۴ جنوری ۱۷۸۵ء مطابق ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو انتقال فرمایا نمونہ کلام یہ ہے۔

غزل (۱۰)

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا — پر اُسے آہ نے اثر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
آپ سے ہم گزر گئے کب کے — کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا
کونسا دل ہے وہ کہ جس میں آہ — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
کیوں بھویں تانتے ہو بندہ نواز — سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۱۱)

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا — تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا
میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے — مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا
گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں — میں پہونچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا
جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے — تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا

قفس میں کوئی تم سے اے ہم صفیرو
خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا

خفا ہو کے اے درد مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

(۱۲)

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا
یعنی کبھی تو اپنے بھی دل کا دماغ تھا

جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں ملا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

گذروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں اے گیا
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

(۱۳)

نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو
الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضی الٰہی ہو

نگینے کے سوا کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے
کہ ہو نام اور کا روشن اور اپنی روسیاہی ہو

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہو

(۱۴)

ہر سبز تھا بستاں میرے ہی اشک غم سے
تھے سیکڑوں ہی ملتے وابستہ ایک نم سے

واقف نہ یاں کسو سے ہم ہیں نہ کوئی ہم سے
یعنی کہ آ گئے ہیں بہکے ہوئے عدم سے

میں گو نہیں ازل سے رہتا ابد ہوں باقی
ہمیرا ابتدا و آخر جاہی کھڑا اقدام سے

گر چاہیے تو ملئے اور چاہیے نہ ملئے
سب تم سے ہو سکے ہے ممکن نہیں یہ ہم سے

مشتاق گر ترا کچھ لکھے تو کیا عجب ہے
ہیں مثل نرگس آنکھیں پیدا ابھی قلم سے

ہر چند بہ تمنا درخور نہیں ہمارے	نزدیک تو جو آئے کیا دور ہے کرم سے
اب ہیں کہاں وہ نالے ہر گرسنگی کی ہے	تھیں سب وہ باتیں ایسے ہم نام تمام سے
ہے ایک نگاہ کافی گو ہووے گاہ گاہے	خیال ہیں نہیں ہے مطلب عاشق کو پیش و کم سے
کاہے کو ہوتی ہم کو گردش بہ نصیب طالع	گر پائیں اپنا یاہر رکھتے نہ ہم عدم سے
آتے ہیں جو ادھر ہیں کب خبر رشتہ رو کسو کے	اے شیخ یہ نہیں ہیں تسبیح کے ستم سے

ہے درد پر بھی کچھ تو پھیری ہی سی ہیبت
گھبرے ہے اور یہی غم چھوٹے جو ایک غم سے

(۱۵) رباعیات

ہم نے بھی کبھی جام و سبو دیکھا تھا	جو کچھ کہ نہیں ہے روبرو دیکھا تھا
ان باتوں کو اب جو غور کرتے ہیں درد	کچھ خواب سا تھا کہ وہ کبھو دیکھا تھا

(۱۶)

کس کا کون! کیا کسو سے کہنا	اپنا اپنا ہر ایک کا لہنا
گزرے ہے اب اس طرح سے اپنا ہی درد	رونا جینے پڑے اکیلے رہنا

(۴) حسن سنہ ۱۷۸۹ء

میر غلام حسن خلف غلام حسین ضاحک۔ بزرگوں کا اصلی وطن ہرات ہے مگر دہلی میں پیدا ہوئے۔ قدیم وضع کے بزرگ تھے۔ آپ نے ابتدا میں میرزا رفیع سودا سے

اصلاح لی اس کے بعد خواجہ میر درد سے استفادۂ سخن حاصل کیا اور سب سے آخر میں ضیاء الدین ضیاء دہلوی کے شاگرد ہوئے دہلی چھوڑ کر فیض آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی اور وہاں نواب سرفراز جنگ کے صاحبزادوں کی مصاحبت میں داخل ہو گئے تھے یوں تو میر حسن جملہ اصناف سخن پر قادر تھے مگر مثنوی سحر البیان ان کے کمال شاعری کا بے نظیر نمونہ ہے جس میں جذبات انسانی کی تصویر کچھ ایسے خوبصورت طریقے سے کھینچی گئی ہے کہ زمانہ حاضرہ میں بھی دلچسپی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ کہنے کو تو مثنوی میں ایک فرضی قصہ نظم کیا ہے لیکن اس میں قدرتی مناظر انسانی کی ایسی سچی تصویریں غم و رنج کے جذبات شادی اور حسرت کے کوائف کو عجب خوبی سے دکھایا ہے اس کی متقدمین اور متاخرین کے کلام میں مثال نہیں ملتی آصف الدولہ کے عہد میں مثنوی کے صلے میں ایک قیمتی دو شالہ عطا فرمایا میر حسن نے سنہ ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء میں وفات پائی مثنوی کا انتخاب یہ ہے۔

(۱۵) عالمِ تحیر

بدن کو جو دیکھا تو زار و نزار — کسی کو کوئی دیوے جیسے فشار

زباں پر ہیں باتیں نہ دل اداس — پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس

نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر — نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر

اگر پھر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں — جو کرتی ہے میلا تو محرم نہیں

جو ہنستی ہے دو دن کی تو ہنسنا — جو کنگھی نہیں ہے تو چوٹی نہیں

جو سینہ کھلا ہو تو دل چاک ہو — غم آلودہ صبح طربناک ہو
نہ منظور ہو پردہ نہ کچھ ایسا کام — نظر میں ہو تیرہ بختی کی شام
ولیکن یہ خوبوں کا دیکھا سبھاؤ — کہ جگت سے ہوتا ہے ان کا بناؤ
جو ماتھے پہ چین جبین غم سے ہو — تو وہ بھی ہو اک موج دریائے مے
وہ آنکھیں جو روتی ہیں پھوٹ پھوٹ — تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ
گریبان سینہ پہ جو ہے کھلا — تو گویا ہے وہ صبح عشرت فزا
نقاہت سے چہرہ اگر زرد ہے — دیا آہ ہونٹوں پہ کچھ سرد ہے
ادا سے نہیں یہ بھی عالم جدا — کہ ہے چاندنی اور ٹھنڈی ہوا

(۱۸) خوابگاہ

وہ پھولوں کی خوشبو وہ ستھرا پلنگ — جوانی کی نیند اور وہ سونے کا ڈھنگ
ہرا اس کے نیچے زری بانات کے — کہ تھے رشک آئینہ صاف کے
کھنچی چادر اک اس پہ شبنم کی صاف — کہ ہو چاندنی جس صفا کا غلاف
کسے اس پہ کتنے وہ منقش کے — کہ تکیوں میں تھے جن کے موتی ٹکے
دھرے اس پہ تکیے کئی نرم نرم — کہ گل آئیں جس کے دیکھے سے شرم

(۱۹) شوخئ رفتار

عجب چال سے وہ چلے نازنیں — کہ مستی میں پاؤں کہیں کا کہیں
بنا چاہیے سر پہ جوڑا پڑی زرد شال — کمر کی لچک اور ٹھسک کی وہ چال

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی	کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی
عجب ایک عالم نقاب بے ساختہ	کہ عالم کا تھا اُس سے دل باختہ

(۵) قائم ۱۷۹۴ء

شیخ محمد قائم نام تھا قصبہ چاند پور ضلع بجنور روہیل کھنڈ کے رہنے والے تھے ابتداء میں خواجہ میر درد سے مشورہ سخن رکھتے تھے پھر میرزا رفیع سودا کے شاگرد ہوئے۔ ان کا شمار ریختہ کے اُستادوں میں ہے۔ سلاست اور صفائی ان کا حصہ تھی ان کے بعض اشعار ضرب المثل کے درجہ تک پہونچ گئے ہیں مثلاً

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا	آہ چُپ بھی رہا نہیں جاتا

اپنے وطن میں ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا ایک مکمل دیوان چھوڑا کوئی صنف کلام ایسی نہیں ہے جو اس دیوان میں نہ ہو۔ لیکن دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل اور مثنوی سے اس شاعر کی طبیعت کو بہت لگاؤ رہا ہے ان کا دیوان ہنوز طبع نہیں ہوا۔ عرصہ ہوا ایک انتخاب مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا تھا اور دوسرا انتخاب ثمار اشعار کے نام سے نواب عماد الملک بہادر بلگرامی نے ترتیب دیا ہے جو مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔

(۲۰) غزل

مجھ سا کوئی جہاں میں آشفتہ سر نہیں	ہر چند زلف یار بھی بے اس قدر نہیں

ساقی تو شب کی درست دراز ہی معاف کر
ظالم قسم ہے مجھ کو مجھے کچھ خبر نہیں

یارب خلش سے آہ کی ہو جو نہ بہرہ مند
جس دل کا تکیہ گاہ سرِ نیشتر نہیں

جوں شمع ایک لغزشِ پا میں گئے ہیں یار
ہستی سے تا بہ نیستی جز دو ان سفر نہیں

بنا رہا ہوں بیخودی کا میں اس مستی کی جسے
آشنب روزِ حشر سے اصلا خبر نہیں

(۲۱)

ایک جا گہ یہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں
ہے عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں

اس کمر سے نگہِ شوق لپٹتی تو ہے لیک
جی یہ دھڑکے ہے کہ آجائے نہ الزام کہیں

تم نے کی دل کی طلب ہم نے کہا دینگے دیں لیک
یوں یہ فرمائشیں ہوتی ہیں سرانجام کہیں

ہائے دیوانے سے پھر میری طرح دو نہ اُٹھا
جن نے دیکھا تجھے اک بار سرِ بام کہیں

عذرِ تقصیر بھی چاہوں گا میں اس سے اے دل
تک تو خاموش ہو دینے سے وہ دشنام کہیں

عزمِ کعبہ کا تو قائم نے کیا ہے لیکن
رہنے کچھ نہ دو ان جامۂ احرام کہیں

(۲۲)

گر پیرِ شیخ و گناہِ مرید مغاں رہے
اب تک تو آبرو سے یہ بھی ہے جہاں رہے

پھر وہ شراب ہوش دل و دیں تو واں رہے
اے ہمنشیں یہ کہہ تو بھلا ہم کہاں رہے

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پر اس طرح
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی مہماں رہے

اے دیدہ دل کو لوٹتے ہو کیا تم ہمیں تو یاں
بہ چھینکنا پڑا ہے کسی طرح جاں رہے

قسمت تو دیکھ یار بھی اپنا گیا تو واں — جس دشت پر خطر میں کئی کارواں رہے
پیارے ہمیشہ ایک سی رنجش میں ہے نہ لطف — ناخوش کبھی ہوئے تو کبھی مہرباں رہے

مسجد سے تجھ نے شیخ نکالا ہمیں تو کیا
قائم رہے مے فروش کی اپنی دکاں رہے

(۶) سوز ۱۷۹۷ء

سید محمد نام تھا قراول پورہ ضلع شاہجہاں آباد کے ساکن۔ ان کے کلام میں ان کے تخلص کا پورا اثر نمایاں ہے یعنی ان کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے ۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۰۹ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۲۳) غزل

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں کچھ جائیگا — ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا پائے گا
قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے — ہاں مگر تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

پھر کبھی کہتا ہوں تجھ سے سوز کو یوں مت ستا
ورنہ سن ظالم! کہیں تو بھی ستایا جائے گا

(۲۴)

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر — کہ تیرا اشک خونیں جا گرے گلزار ہو پیدا
یہاں تک کفر پورا چاہیے گر جائے گلشن ہو — بجائے ہر رگ گل رشتۂ زنار ہو پیدا

قتیلِ خنجرِ مژگاں ہوں کیا یہ کچھ تعجب ہے	کہ ہر بُنِ مو سے سبزی کی جاگہ خار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو ڈر ہے
جو لاکھوں بار ہو وے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

(۲۵)

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا	تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا
نہ پہنچے آہ و نالہ گوش تک اُس کے کبھو اپنا	بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا
خدایا کس کے ہم بندے کہاں دیں سخت مشکل آ	رکھے ہے ہر قسم اس دہر میں دعویٰ خدائی کا

خدا کی بندگی کا سوز ہے دعویٰ تو خلقت کو
ولے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خود نمائی کا

(۷) میر سنہ ۱۸۱۰ء

میر محمد تقی اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم و تربیت پائی عالی دماغی و نازک مزاجی میں یگانۂ روزگار تھے اردو شاعری کے خدائے سخن اور مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں کلام گوناگوں خوبیوں سے لبریز ہے غزل گوئی میں حسن و عشق کے علاوہ اخلاق فلسفہ حکمت کے مضامین پائے جاتے ہیں اردو غزل میں آپ کا وہ رتبہ ہے جو حضرت سعدی کا فارسی غزل میں ان کے کلام میں سادگی کے ساتھ وہ دردمندی ہے جو دوسرے شاعر کے کلام میں شاذ پایا جاتا ہے۔ آخر عمر میں خاک آوارگی کشش نے لکھنؤ پہنچا دیا تھا وہیں سو برس کی عمر پا کر سنہ ۱۲۲۳ھ مطابق سنہ ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔ چھ دیوان مطبوعہ

موجود ہیں۔ حال میں انجمن ترقی اردو نے کلام میر کا عمدہ انتخاب شائع کیا ہے جس کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹیری انجمن کا دلچسپ مقدمہ شامل ہے آپ کا تذکرہ نکات الشعراء بھی جس میں اپنے معاصرین کے حالات درج کئے ہیں طبع ہو چکا ہے بعض کے نزدیک میر صاحب کی پیدائش ۱۱۳۷ھ میں اور انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۲۶)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رخ سے ہے رخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیق جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دست نگہ پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

(۲۷)

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہو گیا
قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

کچھ خطرناکی طریقِ عشق میں پنہاں نہیں
کھپ گیا وہ راہرو اس راہ ہو کر جو گیا

مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں
ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا

میر ہر اک موج میں ہے زلف ہی کا سا داغ
جب سے وہ دریا پہ آ کر بال اپنے دھو گیا

(۲۸)

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ
کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا

دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں
واں چیں جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

مانندِ حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا
دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

تھا پشتہ ریگِ بادیہ اک وقت کارواں
یہ گردباد کوئی بیاباں نورد تھا

گزری مدام اس کی جوانانِ مست میں
پیرِ مغاں بھی طرفہ کوئی پیرمرد تھا

(۲۹)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے | جرس کے بھی وہ ہوش کھوتا رہے گا

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

(١٣٠) قطعہ

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا | یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر | میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا
تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر | سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

(١٤١) غزل

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں

بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانے میں
جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

کاش اب برقع منہ سے اٹھا دو ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر اُن نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگنی اُن نے جوں جوں میں ابرام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

(۳۱)

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

آگے اس متکبّر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا کیا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دُنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماریٔ دل کی رسمِ شہرِ حُسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا درماں جانے ہے

کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیّاد بچہ
طائر اُڑتے ہوا میں سارے اپنا اُسارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت اک سے واقف ان میں سے
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عاشق تو وہ مردہ ہے ہمیشہ اٹھتا ہے دیکھے سے اس کے
یار کے آجانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے

کیا کیا آفتیں سر پہ اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوارِ چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی نادان تلخی کش
دمدار آبِ تیغ کو اس کے آبِ گوارا جانے ہے

(۸) جرأت ۱۸۱۰ء

شیخ قلندر بخش دہلوی بذلہ سنج لطیفہ گو معاملہ بند شاعر تھے۔ سلیمان شکوہ نواب اودھ کی ملازمت میں داخل تھے عالم شباب میں بینائی جاتی رہی تھی طبیعت کو رنگ تغزل سے ایک خاص مناسبت تھی حسن و عشق کے واقعات اور عاشق و معشوق کے راز و نیاز ان کی شاعری کا جزو اعظم ہیں علمی استعداد کم تھی بلکہ

سنہ ۱۲۲۵ھ لکھنؤ میں وفات پائی بعض غزلیات میں ایک ہی مضمون لکھا ہے۔ ایک موقعہ پر اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:-

(۳۲) غزل

اے دلا ہم ہوئے پابندِ غمِ یار کہ تو
اب اذیت میں بھلا ہم ہیں گرفتار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ عاشق ہو اب اتنا تو بتا
جا کے ہم پھوڑتے ہیں پھر ولے پسِ دیوار کہ تو

ہاں کیوں عشقِ بتاں سر نہ اٹھایا تو نے
کفِ افسوس ہم اب ملتے ہیں ہر بار کہ تو

وہی محفل ہے وہی لوگ وہی ہے چرچا
اب بھلا بیٹھے ہیں ہم شکل گنہگار کہ تو

ہم تو کہتے تھے کہ لب سے نہ لگا ساغرِ عشق
نشۂ بادہ سے اب ہم ہوئے سرشار کہ تو

بے جگہ جی کا پھنسانا تجھے کیا تھا درکار
طعن و تشنیع کے اب ہم ہیں سزاوار کہ تو

وحشتِ عشق بری ہوتی ہے دیکھا نادان
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کہ تو

آتشِ عشق کو سینے میں عبث بھڑکایا
اب بھلا کھینچیں گے ہم آہِ شرربار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ ہمراہ کسی کے لگ چل
اب بھلا ہم ہوئے رسوا سرِ بازار کہ تو

عذر کیجے تو یہ مشکل ہے کہ نہیں اے جرأت
دیکھیں ہم اس میں کہیں اور بھی اشعار کہ تو

(۳۳)

میرے ہونے سے تو کچھ گرمیِ بازار نہیں
میں ہوں وہ شئے کہ کوئی جس کا خریدار نہیں

درد کیا جانئے کیا کیا یہ بیاں کرتا ہے
تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی

دہن زخم کہ گویا لب گفتار نہیں
جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں

(۴۵)

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو
کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو

دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت
شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

(۹) انشاء سنہ ۱۸۱۷ء

سید انشاء اللہ خاں دہلوی۔ نواب سعادت علی خاں بادشاہ اودھ کی مصاحبت میں داخل تھے ان کی جامعیت اور علمی قابلیت کم نہ تھی مگر لکھنؤ کا رنگ دیکھ کر ظرافت پر اُتر آئے تھے پھر بھی ان کے کلام میں جدت اور انداز بیان کا خاص لطف پایا جاتا ہے اردو زبان میں سب سے پہلے صرف و نحو کے قواعد منضبط کئے۔ دریائے لطافت جس کی زبان فارسی ہے اس کی مُصنّفہ ہے اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہے جس میں عروض معانی و بیان سب کچھ موجود ہے یہ کتاب حال میں انجمن ترقی اُردو کے زیر نگرانی اُردو میں شائع ہوئی ہے حضرت انشاء کی کُلّیات علم ادب کا عجائب خانہ ہے جس میں دیوان ریختہ دیوان ریختی پہیلیاں طلسمات کے نسخے پشتو کے قواعد۔ مثنویات۔ گرمی کی شکایت بھڑوں کھٹملوں پسّوؤں کے بیانات حکایتیں معمے چیستاں شامل ہیں جو ان کی خداداد ذہانت اور علمی قابلیت کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ کوئی ایسا رنگ نہیں جو کلام میں موجود

نہ ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۳۵) غزل

مجھے رونا آتا ہے شمع سحر پر
کہ بیچاری اب مستعد ہے سفر پر

اجی کیوں رُلاتے ہو مجھکو تمھیں کیا
نہیں رحم آتا مری چشم تر پر

یہی وضع ہے تو مجھے کھوئیے گا
پڑے پھریے گا ہاتھ رکھے کمر پر

اجی جا میں ہے اب کہیں بیٹھ رہئیے
بس اک باندھ تکیہ کسی رہگزر پر

جنوں سے اگر آشنائی ہوئی تو
مطول کو دے مار تو مختصر پر

کچھ اک صاف صاف ایسے لکھ شعر انشاؔ
کہ وہ ماریں چشمک صفائے گہر پر

(۳۶)

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لے اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خیال ان کا پرے ہے عرشِ اعظم سے کہیں ساقی
غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں

نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کہیں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے ان دنوں پہروں
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہیں ہیں صبر کس کو! آہ! ننگ و نام کیا شے ہے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
نئی یہ وضع شرمانے کی سیکھی آج ہے تم نے
ہمارے پاس صاحب ورنہ یوں سو بار بیٹھے ہیں
کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے بھلا انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(۳۷)

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا
کہ پڑا ہے آج خُم میں قدحِ شراب اُلٹا

عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا

چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق
نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب اُلٹا

یہ شب گزشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب اُلٹا

[illegible]
[illegible] اُلٹا

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ہوئے وعدے پر جب جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور
اسے یہ دیکھو کچھ تماشا یہ سنو عتاب الٹا

کھڑے چپ ہو دیکھتے کیا مرے دل اجڑ گئے کو
وہ گنہ تو کہہ بتا جس سے کہ یہ ہوا خراب الٹا

غزل اور قافیوں میں نہ کہے تو کیونکر انشاء
کہ ہوا نے خود بخود آ ورق کتاب الٹا

(۱۰) مصحفی سنہ ۱۸۲۴ء

شیخ غلام ہمدانی امروہہ ضلع مراد آباد کے شیخ زادگان سے تھے عنفوان شباب میں طالب علمی کرنے دہلی آئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہونچے میرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت کے زمانہ میں سید انشاء سے مقابلے ہوئے کسی کے شاگرد نہ تھے مگر زبان میں سودا اور میر کی پیروی کرتے تھے فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے اردو میں چھ دیوان تصنیف کئے تھے مشکل زمینوں میں عمدہ شعر نکالتے تھے سنہ ۱۸۲۴ء ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۳۸) غزل

لائے خط یا ترے عارض پہ جو گلشن لائے
آتش رخ پہ صبا الجھی سو دامن لائے

کیا غضب ہے کہ جو تیغے میں کھائے لپھر
اور نظارہ ترا دیدۂ روزن لائے

[illegible]

دشمن و دوست کو الفت نے تری ایک کیا
ہاتھ پیر ماتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے

ہم ترے واسطے اے غیرت لیلیٰ کب تک
قیس کی طرح پڑے پھرتے ہیں بن بن مارے

وہ جو آنکھیں ہیں تری رہزن و خونیں کافر
قافلے لوٹ لئے سیکڑوں رہزن مارے

ضبط سے مصحفی اب کام مرا درگزرا
کب تلک غم میں کسی کے کوئی تن من مارے

(۳۸)

گرے جو اس کی نظر سے تو پھر کہاں کے ہوئے
نہ ہم زمیں کے ہوئے اور نہ آسماں کے ہوئے

قفس سے چھٹا تک ہی لیویں گے گل کو ایکے برس
جو رخنے بند نہ دیوار گلستاں کے ہوئے

ہو جائے شکر کہ نا کشتنی یہ ہم سے لوگ
تری گلی میں سزاوار امتحاں کے ہوئے

عجب نہیں ہے کہ بلبل کو ہووے نشو و نما
کہ اس ہوا میں یہ خار آشیاں کے ہوئے

نظر سے ناقہ لیلیٰ یہ ہو گیا غائب
کہ لوگ ہر طرف آوارہ کارواں کے ہوئے

متاع حسن کے تو ہے لگے جہاں دیکھو
ہم ایک بار خریدار اس دکاں کے ہوئے

ہزار شکر کہ ان گلرخوں کی مجلس میں
گئے جو ہم تو نہ شرمندہ برگ و پاں کے ہوئے

گلی میں اس کی جو ہم مر گئے تو بعد مرگ
سگ و ہما میں کئی حصہ استخواں کے ہوئے

بلیغ دہر ہے اے مصحفی تو لا شک ریب
جو تھے فصیح وہ بندے تری زباں کے ہوئے

(۱۱) نظیر سنہ ۱۸۳۰ء

ولی محمد اکبر آبادی بزرگوں کا اصلی وطن شاہجہان آباد تھا دہلی کی تباہی اور بربادی کے بعد اکبر آباد آئے اور روضۂ تاج گنج کے قریب سکونت اختیار کی معلمی کا پیشہ کرتے تھے شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے ان کے کلام میں قدرت کے مناظر کی جھلک پائی جاتی ہے بہ نسبت ان کے میلوں ٹھیلوں، آزاد فقیروں کے مجمعوں، پر تکلف مجالس، اور بے تکلف ٹولیوں میں ان کی نظموں کو مزے لے لیکر پڑھا جاتا ہے روزمرہ کے محاورات ہر موقع و محل کی اصطلاحات صاف اور سیدھی زبان میں لکھتے تھے، یہ روایت بھی مشہور ہے کہ شاہ اودھ نے ان کو معقول تنخواہ دینے کا وعدہ کیا تھا اور لکھنؤ بلایا تھا مگر وہ آگرہ کی حدود سے باہر نہ نکلے ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء مطابق ۱۰ صفر ۱۲۴۶ھ کو آگرہ میں انتقال کیا تاج گنج میں دفن ہوئے کلیات نظیر قدیم کے علاوہ اس کا ایک جدید ایڈیشن اعلیٰ پیمانہ پر نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا ہے اور پروفیسر شہباز نے ان کی مبسوط سوانح عمری جس میں کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے. زندگانی بے نظیر کے نام سے لکھی ہے جو مطبع مذکور میں چھپی ہے. آخر میں ان کے منتخب کلام کا مجموعہ محمود صاحب اکبر آبادی نے مع فرہنگ و حواشی آگرہ اخبار پریس میں چھپوایا ہے جس میں محمود صاحب کا مقدمہ اور تبصرہ بھی شامل ہے۔

کلام کا انتخاب یہ ہے

(۳۹) برسات کا تماشا

ساون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے
لپٹے گلے سے سوتے معشوق ماہ پارے
جگنوں چمکتے پھرتے جوں آسماں پہ تارے
گرتی ہے چھت کسی کی کوئی کھڑا پکارے
آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہاتھوں میں ہیں ہر اک کے پھولوں کی لال چھڑیاں
گل بوٹوں کے جو نیچے بوندیں ہیں مینہ کی جھڑیاں
بجلی چمکتی پھرتی اور لگ رہی ہیں جھڑیاں
برسیں ہیں ہزاروں اب موتیوں کی لڑیاں
آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

(۴۰) تاج گنج

یارو جو تاج گنج یہاں آشکار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے
ایسا چمک رہا ہے تجلی سے یہ مکان
ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند
مشہور اس کا نام یہ شہر و دیار ہے
روضہ جو اس مکان میں دریا کنار ہے
جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے
ہر بار جس کے خم پہ مہ نو نثار ہے
تعریف اس مکان کی میں کیا کیا کروں نظیر
اس کی صفت تو مشتہر روزگار ہے

(۴۱) بنجارہ نامہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقیٰ سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی
ایک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی
کیا برتن سونے چاندی کے کیا ہنڈیا چپنی مٹی کی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لیے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جاویگا موقوف ہوا جب اَن اور جل

گھر بار اٹاری چوپاری کیا خاصہ نین سکھ اور ململ
کیا چلون پردے فرش نئے کیا لال پلنگ اور رنگ محل
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل و زمرد سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھرے گی ہر آن بنے گی جان اوپر
نوبت نقارے بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھپر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لعل عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بقچے تاش مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیا سخت مکاں بنواتا ہے کھم تیرے تن کا ہے پولا
تو اونچے کوٹ اٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا اونچی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا
گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنواں کیا کھیتی باڑی پھول چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ آ کر چابک بجلی بدن کا ہانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سئے اور ٹانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک تنکا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۴۳) ہنس نامہ

دنیا کی جو الفت کا ہوا اس کو سہارا
دیکھی جو یہ غفلت تو مرا دل یہ پکارا
اور اس نے خوشی کو مری خاطر میں اتارا
آیا تھا کسی شہر سے اک ہنس بچارا
اک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اس کا گزارا

جھاڑوں میں اگن لاگتے چھپان بنے ڈھیر
طوطے بھی کئی طور کے ٹوئیاں کوئی لہبر
مینا بھی ہے گلگلے بگلے بھی سمنبر
رہتے تھے بہت جانور اس پیڑ کے اوپر
اس نے بھی کئی طرح سے یہ گھر اپنا سنوارا

بلبل نے کیا اس کی محبت میں خوش آہنگ
گلشن میں کلنگوں میں بھی چاہت کی مچی جنگ
اور کبک نے کوئل نے بھی الفت کو لیا سنگ
دیکھا جو طیوروں نے اسے حسن میں خوش رنگ
وہ ہنس لگا سب کی نگاہوں میں پیارا

سیمرغ بھی سو دل سے ہوئے ملنے کے مشتاق
سارس بھی جو اصل کے ہوئے اس کے موافق
گدھ چیلیں بھی پنکھوں سے ہوئے ملنے کے لائق
باز اور لگڑ جرے و شاہین ہوئے عاشق
شکروں نے بھی شکر سے کیا اس کا مدارا

کچھ سیر ادھر کی نہ کچھ عیش نہ ڈر سے
شاخوں سے لگا ٹوٹ کے تھوڑی ہی ہر بیے

غوغائی بگیری دلٹورے نہ پپیہے
لچھ لال جڑے پودنے پاڑے ہی نہ غنچے

پار زہی بھی سمجھتی تھی اُسے آنکھ کا تارا

چاہت کے گرفتار بٹیریں لوے تیتر
ہاریل بھی ہوئے ہٹ کے پپیہا اِدھر اُدھر
بگلوں نے بھی مروؤں نے بھی چاہت میں سنے پر
زاغ و زغن و طوطی و طاؤس کبوتر

سب کرنے لگے اُس کی محبت کا اشارہ

شکل اُس کی نہیں جی میں بٹھی تمام اپنے
ہریال بھی ہوئے اُس کے تئیں چاہنے والے
نہیں چاہ جتا پھر سے چھپا بیٹوں بھی چھپے
جتنے غرض اُس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے

اُس ہنس پہ اُن سب نے دل و جان کو وارا

خواہش یہ ہوئی سب کی کہ ہر دم اُسے گھیریں
دن رات اُسے خوش رکھیں نت سکھ اُسے دیویں
اور اُس کی محبت سے ذرا منہ کو نہ پھیریں
صحبت جو ہوئی ہنس کی اُن جانوروں میں

یک چند رہا خوب محبت کا گزارا

سب ہو کے خوش اُس کی مئے الفت لگے پینے
ہر آن جتانے لگے چاہت کے قرینے
از بسکہ ہر اک نے وہاں بھر لئے سینے
اُس ہنس کو جب ہو گئے دو چار مہینے

اک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

یاں لطف و کرم تم نے کئے ہم پہ ہیں جو جو
تقصیر کوئی ہم سے ہوئی ہووے تو بخشو
تم سب کی یہ خوبی ہے کہاں ہم سے بیاں ہو
لو یارو ہم اب جاوینگے کل اپنے وطن کو

اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

اتنا تک تو بہت ہم سے ہے فرصت ہم آغوش — اب یاد وطن دل کو بھلائے ہوئی ہم دوش
جب حرف جدائی کا پرندوں نے کیا گوش — اس بات کے سنتے ہی جو ہر اک کے اڑے ہوش
سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا

ن تجھے تنہا ہے ہمیں کب چین پڑینگے — اک آن نہ دیکھیں گے تو دل غم سے بھرینگے
گر تم نے یہ ٹھہرائی تو کیا سکھ سے رہیں گے — ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
یہ درد تو اب ہم سے نہ جاوے گا سہارا

پھر ہنس نے یہ بات کہی اُن سے کئی بار — کچھ بس نہیں اپنا چلنے کی ساعت ہے میں ناچار
آنکھیں ہوئیں اشکوں سے پرندوں کی گہربار — اتنے میں جو شب گزری ہوئی صبح نمودار
پر اپنا ہوا پردہ میں اس ہنس نے مارا

وہ ہنس جب اُس پیڑ سے واں کو چلا ناگاہ — منہ پھیر کے یا پھر سے ملن کی جنہیں لی راہ
دیکھا اُسے جاتے ہوئے واں سے تو کر آہ — سب ساتھ چلے اُس کے وہ ہمراہ ہوا خواہ
ہر ایک نے اُڑنے کے لئے پنکھ پسارا

وہ ہنس کی اُن سب کو رفاقت ہوئی غالب — جب واں سے چلا وہ تو ہوئی بے بسی غالب
کلفت تھی جو فرقت کی وہ سب رہی غالب — دو کوس اُڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یارا

پر ان کے ہوئے پر جنہیں دوری کی پڑی اوس — دینے لگے گر رفاقت کی کریں کیونکہ قدم بوس
تھک تھک کے لگے کرنے تو کرنے لگے افسوس — کوئی تین کوئی چار کوئی پانچ اُڑا کوس

	کوئی آٹھ کوئی تو کوئی دس کوس ہیں ہارا
کچھ بن نہ سکے اُن سے رفیقوں کے جو ان کا یار جب دیکھی وہ مشکل تو پھر آخر کے ہیں سہارا	اور اتنے اُٹھے ساتھ کہ کچھ ہو نہ سکا پار اور پانی [illegible] کوئی [illegible] کوئی ہو گیا بیمار
	کوئی اور اٹھا آگے جو تھا سب ہیں گرا را
تھی اس کی محبت کہ جو ہر ایک نے پی تھی جب ہو گئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی تھی	سمجھے تھے بہت دل میں الفت کو بڑی بات جیلیں ہیں کھنچے گئے اور بازو بھی تھک گئے
	اس ایلچی کی منزل میں کیا سب نے کنارا
دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی ہے یہ کچھ راہ تا پیار نہ تھا ہو جس جا میں ڈال کیجئے کیا جاہ	جب مشکل یہ پڑی تو بھلا کیونکر ہو نباہ سب رہ گئے ساتھ کے ساتھی تھے نظر آہ
	آخر کے تئیں جس ایسا ہی سہارا

(۱۲) شہیدی

منشی کرامت علی خاں ولد عبد الرسول خاں عرف شہیدی متوطن دارالخلافہ [illegible] کے باشندے تھے۔ شاعری میں مصحفی اور قیصر دہلوی کے شاگرد تھے۔ فقیرانہ لباس میں عمر دراز تک بریلی میں رہے تھے۔ اُن کا نعتیہ و عاشقانہ کلام مستانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ [illegible] ہو چکا ہے۔ ۱۲۵۰ھ میں جس وقت مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور روضہ مبارک کو دیکھا تو فرط شوق [illegible] میں آپ کا [illegible] عمر کی [illegible] ہو گیا۔ ان کا یہ شعر مقبول

ہو گیا سہ	تمنا ہے کہ رخصتوں پر تمتے و نغمے جا بیٹھے قفس جب ٹوٹے طائر رخ مقید کا	

(۴۶) غزل

بک گیا میں جو ان کے عوض دل ہوتا	کار عشاق نہ اس مرتبہ مشکل ہوتا
گھر سے جب میں گیا صحرا کے تجلی جیسے	تجھ کو گر رخ پہ اٹھا پردہ محمل ہوتا
ڈھونڈھ جا نالب غم دشت میں آکے اگر ایک گیا	اس میں نقصان ترا کیا تھا جو حب محفل ہوتا
دل میں ارمان ہی رہا حبیب حسین کا اس	کدھر سے ساتھ وہ زمینہ تمنا کا ہوتا
اس کی بات ہی کے لئے پھول ہیں جیتا بچھ	ہاتھ اس کا مری گردن میں حائل ہوتا

تمام ہیں اس کے تو الطاف شہیدوں کی سب حبیب
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

(۴۷)

غضب ہے کہ حسین بتیا کا فقرہ بنیا دم نکلتا ہے	بنیا آتا ہوں تو اس کے کوچہ سے ہر دم نکلتا ہے
نہ رکھا آنکھوں پہ میری کا آستین لطف از ہم	کہ اشک سرخ کے ہمراہ دل کا غم نکلتا ہے
دکھا کر اپنی آرایش بڑی مجھ کو نہ دھیان کا	کسی کے سا وہیں ہیں اور یہی عالم نکلتا ہے
وہ کب خاطر میں لاتا ہے دھمکے زندہ گئے ہو	مجھے یہ کہتا ہے ظالم ہے پھنسا دل کا غم نکلتا ہے
سمجھ کر بھیجتے ہیں حبیب دل کا راز کہتا ہوں	تجلی ہے ڈرتا ہوں کیا کیا جنبہ محرم نکلتا ہے
بنا دیتا ہے کوچہ قمر کا پڑھے کبھی بیٹھا	کھنچا جیب حیدری ایسی تا کا صبا حم نکلتا ہے

شہیدی سے نہیں واقف مگر اتنا تو واقف ہے
کہ راتوں کو کوئی کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

(۱۳) ناسخ ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش نام۔ اصلی وطن لاہور تھا۔ فیض آباد میں تعلیم پائی تھی فارسی کے ماہر تھے اردو زبان کی تلاش خراش اور بندشوں کی چستی؛ رعایت کا ذوق، یہ سب ان کی ایجاد ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو نیا جامہ پہنا دیا تھا اُن کا اعلیٰ ترین پایہ تحقیق ورن کی استادی مسلم ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں دیگر شعرائے لکھنؤ کی طرح مبالغہ اور تشبیہات سے زیادہ کام لیا ہے لیکن اس کو اس طرح نبھایا ہے کہ اس سے کلام کا زور گھٹنے نہیں پایا۔ یہ اُن کی استادی پر دال ہے۔ چونسٹھ (۶۴) پینسٹھ (۶۵) برس کی عمر پا کر ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں دنیا کو خیرباد کہی۔ کلیات ناسخ مطبوع خاص و عام ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

غزل (۴۳)

جو دل ہی ٹوٹ گیا کیا ہوں شعر تر پیدا
ہوئے ہیں شاخ شکستہ سے کب ثمر پیدا

وہ نخل باغ جہاں ہیں ہم ان میں کہ ہوتی ہے
ہر ایک شاخ پئے دستہ تبر پیدا

کیا ہے آتش غم نے مرا یہ خشک لہو
کہ مثل سنگ رگوں میں ہے ہوئے شرر پیدا

شگفتہ غنچہ نہ جب تک ہو بو نہیں آتی
ہو چاک چاک اگر دل تو ہو اثر پیدا

جو ہیں حسین وہ مفلس کبھی نہیں رہتے
گلو کے ساتھ ہی ہوتا ہے زر پیدا

میں بے خبر ہوں مگر ہے مجھے جنونِ عشقِ نہاں
ہوئے ہیں داغ چھپانے کو ہوئے مہر پیدا

یہ رنگت اُس کی سنہری ہے گر نہائے کبھی
نیا سپیدے کریں حمام سے بھی زر پیدا

نہ داغ یاس سے گھبرا ہے آئے گی اُمید
گلوں کے بعد ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا

بلائے چشم نہ حسن اور نہ نغمہ آفتِ گوش
کریں وہ حسین بنے ہیں جو کور و کر پیدا

غزل (۴۴)

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کسی خورشید رو کو جذبۂ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

شفق سمجھا ہے اُس کو ایک عالم نے بیدردی
فلک پر گر بگولا جا لگا خاکِ شہیداں کا

سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے
کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا

نقابِ شوخ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

قفس کی جست ہی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

مرا ویرانہ مثلِ آئینہ معمورِ حیرت ہے
یقیں ہر رخنۂ دیوار پہ ہے چشمِ حیراں کا

کسی سے دل نہ اُس خستہ مرا میں نے اٹکایا
نہ اُلجھا خار سے دامن کبھی بھرے بیاباں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

(۴۵)

یہ نور ہے روئے بے جبیں کا۔ کہ ہے خجل چاند چودھویں کا

جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا۔ وہ ایک نافہ ہے مشکِ چیں کا
پہ اُس کی ہے ساعدوں کا عالم۔ کہ جس نے دیکھیں ہوا وہ بیدم
نیامِ تیغ قضائے مبرم۔ تعجب ہے قاتل تری آستیں کا
یہ جوشش ہے یہاں ہے اشک کا یم۔ کہ ساتوں دریا ہیں ایک قطرے سے کم
جسے کہ کہتے ہیں سینۂ جہنم۔ شرر ہے اک آہِ آتشیں کا
بُرا ہے بد بخت عاشقی کا۔ نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا
بنا ہے عشقِ بتاں میں ٹیکا۔ نشانِ سجدہ مری جبیں کا

طمع ہے انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے۔ بلند تر رتبہ اس زمیں کا

(۱۴) میر ممنون سنہ ۱۸۴۴ء

میر نظام الدین۔ سید قمر الدین خاں منت دہلوی کے بیٹے اور شاگرد تھے۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے قلم کا لکھا ہوا دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ دیکھا تھا۔ عہدِ انگریزی میں اجمیر کے صدر الصدور تھے۔ سنہ ۱۲۵۷ھ مطابق سنہ ۱۸۴۴ء میں انتقال ہوا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(۴۶) غزل

سرسبز نخلِ دوستی ہوئے بغیر دل کہاں | اُگتا ہے بزیر آسماں الٹے زمیں کا بل کہاں

آفت سے ہم چل بھی بسے پر بزم خالی دیکھ کے
بیٹھیں سامعوں خفت نہ کچھ اور تو واقف نہیں
بحر حوادث کا یہ شور یا مخالف کا وہ زور
کشتی شب کا مرتبہ تک دیکھو اک نقطہ دار
تلو یک سا جب رہ کا بے خضر کوئی نہ یار و رہبر
آفت ہم ہیں یا نہ قفس ای ہم صفیر و کیا خبر
سو بار ہم ہیں کہہ چکا خوبوں سے مت مل ہے برا
شیشہ بھی ہے ساقی بھی ہے شمع بھی یاریں نہ رہے

اس نے نہ پوچھا ایک دن آج وہ بیمار کہاں
مفتون جی کس پر ہوا دل ہو گیا مائل کہاں
کشتی بھی تو ہی موج میں تو ڈوب آئے اپنا ساحل کہاں
اس لٹ قضا نے دم لے تو بس پہنچا قاتل کہاں
بخشیں کہ ہے سر گشتہ ہیں یا منزل کہاں
غنچے کی صورت لیکن ہیں آگے گل نہ گئے ہیں کھل کہاں
لیکن سمجھتا ہی بھلا اپنا دل جاہل کہاں
وہ خوبی مجلس کہاں وہ رونق محفل کہاں

کچھ عقدۂ مشکل کا تو ممنون ہا شیفتہ نہ کر
مشکل کشا جیسا ہو یہ ہوتی ہی پھر مشکل کہاں

(۱۵) آتش ۱۸۴۷ء

آتش خواجہ حیدر علی ولد خواجہ علی بخش دہلوی ۱۷۶۷ء (۱۱۸۱ھ) میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے والد نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی خواجہ صاحب نہایت آزاد مزاج خوش طبع شاعر فن سخن میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے تلمذ حاصل تھا شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے سلاست زبان اور صفائی کلام نے لکھنؤ میں ان کی جادو بیانی کے ڈنکے بجا دیئے تھے غزل میں حسن و عشق کے علاوہ اخلاقی مضامین بھی لکھے تھے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا

کلیات آتش جس میں دو دیوان ہیں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

(۴۹)

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا / ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا
گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش / بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا
جس چشم کو حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی / جو سینہ کہ صد چاک ہو اشانہ ہے اُس کا
وہ یاد ہے اُس کی۔ کہ بھلا دے دو جہاں کو / حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا
یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے / قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُس کا
آوارگی نکہت گل۔ ہے یہ اشارہ / جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اُس کا

شکرانہ ساقی ازل کرتا ہے آتش
لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

(۵۰)

خار مطلوب جو ہووے تو گلستاں مانگوں / بجلی گرنے کو جو جی چاہے تو باراں مانگوں
خاک میں بھی جو ملوں میں تو کبھی صحرا میں / تم سے مٹی بھی نہ اے گبر و مسلماں مانگوں
بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا / بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں
تپ مجھے عشق کی ہے [illegible] / زخم خنداں ہو اگر میں گل خنداں مانگوں
یاس حرماں ہو جو لاحق ہے کہیں بھی تو جاؤں / نعمت عشق کے قابل لب و دنداں مانگوں
ملتی ہے مانگنے سے باغ جہاں میں جو مراد / گل سے بلبل کے کفن کیلئے داماں مانگوں

 انتخاب زرّیں

جامۂ جسم بھی ٹکڑے کا نہیں دستِ جنوں	پیرہن خاک ہیں دیوانۂ عریاں مانگوں
سختیٔ آزردگی نے زباں کو یہ اثر بخشا ہے	تلخیٔ مرگ مزہ دے جو نمکداں مانگوں

کب سے در پہ ترے سائل ہوں میں آتش کی طرح
وہ ملے مجھ کو جو کچھ اے شہِ خوباں مانگوں

(۱۶) گویا ۱۸۴۶ء

نواب نصیر محمد خاں گویا امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا زمانہ پایا تھا صاحبِ دیوان تھے ان کا دیوان ۱۲۴۲ھ میں مرتب ہو چکا تھا لیکن ان کے طبع کی نوبت ان کی زندگی کے بعد آئی سب سے پہلی مرتبہ اس کو ۱۸۸۶ء میں مطبع نولکشور نے کانپور میں چھاپا تھا ۱۸۴۸ء مطابق ۱۲۶۴ھ میں انتقال ہوا۔ غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

(۵۱) غزل

پھر یہ دل شیفتۂ زلفِ پریشاں ہوگا	پھر مرا جوشِ جنوں سلسلہ جنباں ہوگا
اے جنوں پھر مجھے خوش آنے لگی عریانی	پھر نہ دامن کا پتہ ہے نہ گریباں ہوگا
پھر بہار آئی ہوا جوشِ جنوں پھر مجھ کو	چاک پھر گل کی روش پھر گریباں ہوگا
پھر ہوا شوقِ تماشا مجھے پھر ہونگا شہید	پھر گلا میرا تہِ خنجرِ براں ہوگا
پھر لگی لالہ رخوں سے مجھے الفت جی نے	سینہ پھر داغوں سے اپنا گلستاں ہوگا
پھر چلیں گے تماشا دیکھ کے گلزار میں	پھر ہر اک سرو چمن سرو چراغاں ہوگا

پھر ترے قد کا خیال آنے لگا گلشن میں
نخلِ ماتم مجھے پھر سروِ گلستاں ہوگا

پھر کسی آئینہ رخسار سے الفت ہوگی
صورتِ آئینہ پھر دل مرا حیراں ہوگا

چاہ پھر تیری جھنکائے گی کنویں میں اے یوسف
پھر یہ دل شیفتۂ چاہِ زنخداں ہوگا

پھر لکھوں گا تری رفتار کی خط میں تعریف
نامہ بر پھر مرا یہ کبکِ خراماں ہوگا

گھر میں جی پھر مرا گھبرانے لگا آپ سے آپ
اے جنوں پھر یہ مکاں خانۂ زنداں ہوگا

پھر ہوا عشق ترے ناوکِ مژگاں سے مجھے
پھر عوض دل کے مرے سینہ میں پیکاں ہوگا

یاد پھر یار کی تڑپائے گی بجلی کی طرح
ابر پھر ساتھ مرے رونے کو گریاں ہوگا

پھر مرے نالوں سے ہو جائے گا محشر برپا
چاک پھر صبحِ قیامت کا گریباں ہوگا

پھر خوش آتی ہے مرے دل کو شبِ ماہ کی سیر
عشق پھر چاند سے مکھڑے کا دوچنداں ہوگا

پھر ہوا جوشِ جنوں جائیں گے پھر صحرا کو
پھر ہر اک آبلے میں خارِ مغیلاں ہوگا

تجھ سے پھر مرنے پہ خوش چشم کریں گے کاوش
سبزہ پھر قبر کا پامالِ غزالاں ہوگا

پھر طبیعت مری آنے لگی اک کافر پر
پھر نہ دل ہوگا نہ دیں ہوگا نہ ایماں ہوگا

پھر مزہ عشق کا چکھیں گے مرے زخمِ جگر
ہاتھ میں پھر مرے قاتل کے نمکداں ہوگا

ان دنوں پھر تجھے گویا ہے جو ہچکی سی لگی
پھر ارادہ طرفِ ملکِ خموشاں ہوگا

(۱۷) مومن ۱۸۴۸ء

حکیم مومن خاں ولد حکیم غلام نبی خاں دہلوی خاندانی شریف اور طبیب تھے ان کے اسلاف کشمیر سے دہلی آئے تھے اور شاہ عالم کے عہد میں موضع بلاہہ پرگنہ نور نول (پنجاب) انہیں جاگیر عطا ہوئی تھی ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں پیدا ہوئے شاہ نصیر کے شاگرد تھے مگر تھوڑے دنوں بعد انہیں اپنا کلام دکھانا چھوڑ دیا اور ایسی مشق سخن بڑھائی کہ خود استاد ہو گئے وارفتہ طبیعت عاشق مزاج آدمی تھے نازک طبع عالی خیال تھے غزل کے علاوہ قصائد میں بھی ان کا خاص رنگ تھا اور مثنوی میں تو وہ رنگ اختیار کیا ہے جو بے مثل ہے ان کا تخلص اعلیٰ درجہ کا ہے غالب کے کلام کی طرح ان کا کلام بھی ابھی پرانا نہیں ہوا جب پڑھئے نہایت لطف آتا ہے ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۴۵ء کو کوٹھے سے گر کر ۵۲ سال کی عمر میں جوان فوت ہوئے مہندیوں کے قبرستان میں دہلی کے مرحوم محدثین کی درگاہ کے باہر شمالی دیوار کے زیر سایہ دفن ہیں۔ دیوان موجود ہے۔

(۵۲) قطعہ

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ جس سے | کہتے تھے مومن اور بہت دیندار تھا
کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں | جو تھا سو اس کو دیکھ کے زار و نزار تھا
عبرت کی جا ہے ان مضمونوں نے کیا خراب | ملنے سے جن کے متقی ننگ و عار تھا
بیمار کر دیا تپ ہجر بتاں نے آہ | کیا ہو گئے وہ روز کہ پرہیزگار تھا
یاتو ہمیشہ رات کٹے تھی خود شب اختر سے | اب اپنے سر پہ داغ جنوں شعلہ بار تھا

اختر شماری شبِ غم نے بھلا دیا — جتنا خیال پرسشِ روزِ شمار تھا
ہر ایک کی طرف نگہ بے کسانہ تھی — کس کی نگاہِ لطف کا امیدوار تھا
ہمت سے اور ناز اٹھانے کی آرزو — باقی تھی گو کہ ضعف سے جینا بھی بار تھا
ہر دم ہوائے آہ سے اڑتی تھی منہ پہ خاک — جتنی کہ سر میں گرد تھی دل میں غبار تھا

زخموں میں بس کہ مشک بھرا تھا میں کیا کہوں
عالم بدن کا اُن کے عجیب لالہ زار تھا

غزل (۵۳)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھا بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامتِ اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی ایسی بات اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بُری لگی
تو بیان سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا بات میں نے وہ کوٹھے کی ترے دل سے صفا اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے باخدا۔ جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(۵۴)

دفن جب گور میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوائے بت تیرا
اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدیٔ زنداں ہوں گے

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اُٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے

تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے
گُل نہ ہوں گے شررِ آتشِ سوزاں ہوں گے

غور سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوئے حرم
کیا کہیں اس کے سگِ کوچہ کے قرباں ہوں گے

داغِ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی وہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

(۱۸) تسکین ۱۸۵۱ء

میر حسین ولد میر حسن عرف میرن صاحب ان کا سلسلہ نسب میر حیدر خاں تک پہنچتا ہے جو حسین علی وزیر فرخ سیر کا قاتل تھا حضرت تسکین سنہ ۱۲۱۸ھ میں دہلی پیدا ہوئے فارسی مولوی امام بخش صاحب صہبائی دہلوی سے پڑھی ابتدا میں شاہ نصیر دہلوی کو اپنا کلام

دکھاتے رہے پھر حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے معاش کی تلاش میں کچھ دنوں تک لکھنؤ میرٹھ وغیرہ قیام رہا پھر رامپور میں ملازم ہوگئے اور ۱۲۶۲ھ میں یہیں انتقال کیا پچاس سال کی عمر پائی انھوں نے شاہ نصیر مرحوم کا دیوان ترتیب دے کر اردو کی ادبی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے ترکیب بندش اور میدان تخیل میں اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے تھے ان کا دیوان نایاب ہے نمونہ کلام یہ ہے:

غزل (۵۵)

کر سکے دفن نہ اُس کوچہ میں احباب مجھے
خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

ہجر میں پاس نہ ہے زہر نہ خنجر افسوس!
نہ دیئے موت کے بھی چرخ نے اسباب مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی
بات تو کرنے دے اُس سے دلِ بیتاب مجھے

نام تسلیم پہ یہ مضمون بندش نا زیبا
تھا تخلص جو سزاوار تو بیتاب مجھے

(۱۹) وزیر ۱۸۵۴ء

خواجہ محمد وزیر لکھنوی خلف خواجہ محمد فقیر۔ آپ خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی کی اولاد میں تھے حضرت ناسخ کے تلامذہ میں مامور تھے کلام میں حسن و عشق کے ساتھ اخلاق اور تصوف کی چاشنی موجود ہے سب سے پہلے آپ کا دیوان ۱۲۷۲ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے چھاپا تھا اس کے بعد دوسری جگہ طبع ہوا عام طور پر بازاروں میں ملتا ہے ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۴ء

میں وفات پائی۔ خواجہ صاحب کی یہ غزل زبان زد خلائق ہے۔

(۵۶) غزل

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا غیروں کو قتل اس نے موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو آئی نصیبِ دشمناں ہو کر

بناوٹ نے بگاڑا باتیں سنوا ہیں خموشی نے
نہ پوچھو ہم نے کیا ہی منہ کی کھائی بے زباں ہو کر

وہ پیاسا ہوں نکل کر تیغ پر آب اس نے جب کھینچی
نکل آئی دہانِ زخم سے سوکھی زباں ہو کر

ادا سے جھک کے ملتے ہو گلے سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر

جوابِ نامہ کیا لایا باتیں بیجا ہیں جاں آئی
گیا یاں سے کبوتر واں سے آیا مرغِ جاں ہو کر

کہیں گر زمانہ زر گور ہے کو زیر اٹھ تو زیبا ہی
کیا ہے میں نے پیارا سنگ حرفا نہ سخت جاں ہو کر

(۲۰) ذوق ۱۸۵۵ء

شیخ محمد ابراہیم ولد شیخ محمد رمضان دہلوی ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) کو پیدا ہوئے شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے ۱۹ سال کی عمر میں خاقانی ہند کا خطاب دیکر اپنے دربار کا ملک الشعرا بنا دیا۔ ابو ظفر بادشاہ ولیعہدی کے زمانے ہی میں ان کے شاگرد ہو گئے تھے کلام میں عاشقانہ معاملہ بندی اور رندانہ مضامین کی شوخی کی بہ نسبت متانت زیادہ ہے

زبان کی صفائی محاورہ بندی اور نمایشوں کی چستی کا ان کو خاص خیال ہی غزلوں میں مختلف موقع پر ضرب الامثال کو نظم کرنا انھیں کا حصہ ہی ان کے قصائد خاص طور پر ممتاز ہیں ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۵ء کو انتقال کیا پروفیسر آزاد نے لکھا ہی کہ مرنے سے تین گھنٹے قبل یہ شعر تصنیف کیا تھا ؂

کہتے ہیں ذوق آج جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ان کا ایک مختصر دیوان اُردو جسے حافظ غلام رسول ویران نے ۱۲۷۹ھ میں ترتیب دیا تھا عام طور پر رائج ہی ۱۸۹۰ء سے کچھ قبل دیوان کو بہت سی غزلوں اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ پروفیسر آزاد نے ترتیب دیا جو لاہور سے شائع ہوا ہی. نمونہ کلام یہ ہی:-

غزل (۵۷)

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا	جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا	اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفس امّارہ کو گر مارا	نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کی	تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا
نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے کر کے	جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا
تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے	الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہی مثل قلقل مینا	کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

میرے آنسو ہمیشہ ہیں بہ رنگ لعل غرق خوں	جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا
جگر دل دونوں پہلو میں ہیں زخمی اس نے کیا جانے	ادھر مارا تو کیا مارا ادھر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں	اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دل بدخواہ میں تھا مارنا یا چشم بد بیں میں
فلک پر ذوق تیر آہ گر مارا تو کیا مارا

(۵۸)

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا		ہے حسرت پابوس نکل جائے تو اچھا
جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر		جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا
بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا		لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا
ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے		لینے کو خبر اس کی اجل جائے تو اچھا
کھینچے دل انساں کو نہ وہ زلف سیہ فام		اژدر کوئی انساں کو نگل جائے تو اچھا
اے گریہ نہ رکھ میرے تن خشک کو غرقاب		لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا
تاثیر محبت تو عجب خبط کا عمل ہے		لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا
فرقت سے تری تار نفس سینے میں میرے		کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا
ہاں کچھ تو ہو حاصل ثمر نخل محبت		یہ سینہ پھپھولوں سے جو پھل جائے تو اچھا
دل گر کے نظر سے تری اٹھنے کا نہیں پھر		یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا
وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر	ق	اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یونہی ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یاں سے
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

ہو قطع رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

(۵۹)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ہم سا بھی اس بساط پہ کم ہوگا بد قمار
جو چال ہم چلے وہ بہت ہی بری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہو عمر خضر بھی تو ہو معلوم وقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

(۶۰)

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

چاہیں گر چارہ جراحت کا محبت والے
بیچیں الماس و نمک سنگِ جراحت والے

گئے جنت میں اگر سوزِ محبت والے
تو یہ جانو رہے دوزخ ہی میں جنت والے

ساقیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
صبح محشر کو بھی اٹھیں نہ ترے متوالے

ہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

کس مرض کی ہیں دوا لب جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پانوں بقدر وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

ہائے لے حسرت دیدار مری جائے گو بھی
لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے

نہیں خبر شمع مجاور مری بالین مزار
نہیں جز کثرت پروانہ زیارت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
دیکھو تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

کیا تماشا ہے کہ مثل مہ نو اپنا فروغ
جانتے اپنی حقارت کو ہیں شہرت والے

دل سے کچھ کہتا ہوں میں مجھ سے ہے دل کچھ کہتا
دونوں اک حال میں ہیں رنج و مصیبت والے

تو جو آجائے تو ہے درد محبت کی دوا
میرے ہمدرد ہوں بیمار و نصیحت والے

چھوڑ دیتے ہیں قلم جوں قلم آتشباز
میری شرح تپش دل کی کتابت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دل بیمار کے دو ہی ہیں عیادت والے

تو مرے حال سے واقف ہے پہ اے غفلت کیش
تیرے انداز تغافل ہیں غفلت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

(۴۲) صبا سنہ ۱۸۵۵ء

میر وزیر علی ولد میر بندہ علی لکھنوی خواجہ آتش کے ممتاز شاگردوں میں تھے عاشقانہ رنگ میں مزیدار شعر کہتے تھے آپ کا دیوان چھپ چکا ہے۔ ان کو حضرت واجد علی شاہ کے یہاں سے دو سو روپیہ ماہوار ملا کرتے تھے سنہ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۵ء) میں گھوڑے سے گر کر انتقال کیا نمونہ کلام یہ ہے۔

(۶۱) غزل

اے صبا جذبہ یہ جس دم دلِ ناشاد آیا
میرے آغوش میں اُڑ کر وہ پری زاد آیا

دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

بن گیا خالِ جبیں کوکبِ بختِ خورشید
کس ترقی پہ ترا حُسنِ خداداد آیا

(۶۲)

شور جس کا ہے وہ ہے عشقِ جنوں زا دل میں
بڑھ گیا ہے کہیں حُسن کا سودا دل میں

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی
لیجئے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں

عرصۂ حشر میں ہوگا گذری کا عالم
لے نہ جانا کہیں دُنیا کا بکھیڑا دل میں

چھا گیا لیجئے بڑھ کر یہ چمنِ ہستی پر
نخلِ اُلفت کا لگایا تھا ذرا سا دل میں

اے صبا جس کے لئے ہوں میں پریشان خاطر
جانتا ہے وہ مجھے گیسوؤں والا دل میں

(۶۳)

مغتنم ہے باغِ عالم کی ہوا دو چار دن
صورتِ گل ہے یہاں نشو و نما دو چار دن

سبزۂ خط کا نمو ہے چاند سے رخسار پر
دل تنگ پر چھوڑ تو زلفِ دوتا دو چار دن

او بتِ کافر تری اللہ سے ہے پڑا پیار
آشنا دو چار دن نا آشنا دو چار دن

دُعائے وصل سُن کر وہ صنم کہنے لگا
بیٹھ کر مسجد میں کر یادِ خدا دو چار دن

مجھ گریباں چاک کے مرنے ہی اک وحشت رہی
وا رہے اُس شوخ کے بندِ قبا دو چار دن

روز آتی ہے لبِ گورِ غریباں سے صدا
شادی و غم ہے پئے شاہ و گدا دو چار دن

نکہتِ گُل پھر کہاں بادِ بہاری پھر کہاں	باندھ لے اے باغباں بہتی ہوا دو چار دن
دام پیدا کیجئے ہو چکی مفلس ہوئے	بیٹھئے مسجد میں بن کر پارسا دو چار دن

بادۂ گلگوں پئے ہر روز چل کر باغ میں
موسمِ گُل کے یہی ہیں اے صیاد دو چار دن

(۲۲) تسنیم ۱۸۵۷ء

نواب سید محمد خاں فرزند نواب سراج الدولہ غیاث الدین محمد خاں بہادر نصرت جنگ نیشاپوری لکھنؤ کے والا پہلے فیض آباد میں رہتے تھے پھر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۱ ربیع الاوّل ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے جب تک وہاں رہے اپنا کلام میر مستحسن خلیق والد میر انیس کو دکھایا۔ لکھنؤ میں آکر آتش کے شاگرد ہوگئے۔ اردو شاعری میں قفس، صیاد، آب و دانہ، گرفتاری وغیرہ کے مضامین ان کا حصہ ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں زندہ تھے غدر سے کچھ دنوں قبل انتقال کیا۔ دیوان ہر جگہ ملتا ہے۔ یہ غزل زبانِ زد خاص و عام ہے۔

غزل (۶۴)

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیاد	میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
اُجاڑا موسمِ گُل ہی میں آشیاں میرا	الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد
اُداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے	کئی برس میں ہوا ہے مزاجداں صیاد
دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانے نے	وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

ہمدموں کو کھولے سے ظالم جو بند کرتا ہے
الٰہی دیکھئے کیوں کر نباہ ہوتا ہے
رہے نہ قابلِ پرواز بال و پر میرے
قفس پہ رکھنے لگا اب تو ہار پھولوں کے

قفس کو لے کے میں اُڑ جاؤں گا کہاں صیاد
زباں دراز ہوں میں اور بے زباں صیاد
قفس سے اُڑ کے میں اب جاؤں گا کہاں صیاد
ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہرباں صیاد

فریب دانہ نہ کھاتا میں زینہار ای زاہد
نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

(۶۵)

خود پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلیٰ تیرا
ایک عالم کو ترے اسم کا ہے وردِ زباں
دیدِ لیلیٰ کے لیئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
جستجو میں نہ جو دوڑیں تری ٹوٹیں وہ پاؤں
تو ہی خلق نے اس کو بنایا ہے یہ قدرت سے

سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا
تو ہے یکتا کوئی ثانی نہیں ہوتا تیرا
میں ہی کچھ ذکر نہیں کرتا ہوں تنہا تیرا
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا
سر وہ کٹ جائے نہ ہو جس میں کہ سودا تیرا
تو ہی چاہے گا تو بگڑے گا یہ پتلا تیرا

عاشقِ روئے پری شیفتۂ حور نہیں
جانِ جاں کہتا ہے دیوانہ و شیدا تیرا

(۲۲۳) اختر سنہ ۱۸۵۸ء

ملک الشعراء قاضی محمد صادق خاں ولد قاضی محمد لعل ہگلی (ملک بنگال) کے قاضی زادوں میں تھے مگر علم پرستی اور ذوقِ سخن نے ان کو وطن چھڑا کر لکھنؤ رہنے پر مجبور کیا میرزا قتیل کے عقیدتمند شاگرد تھے۔ فارسی۔ اردو۔ دونوں زبانوں میں شعر لکھتے تھے آپ نے ایک تذکرہ آفتاب عالم تاب کے نام سے مرتب کیا تھا جس میں پانچہزار شعراء کا حال اور انتخاب درج تھا۔ غازی الدین حیدر والئی لکھنؤ نے ان کو ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا سنہ ۱۸۵۸ء (۱۲۷۵ھ) میں وفات پائی۔ صبح صادق۔ نور الانوار۔ محامد حیدریہ۔ دیوان فارسی۔ دیوان ریختہ۔ آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کا مصنفہ تذکرہ آفتاب عالمتاب نایاب ہے آپ کا یہ قطعہ نہایت مشہور ہے۔

۶۶ قطعہ

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر شاقیا — دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا
کہنے لگا ز راہِ تبختر مجھے بہ طنز — معلوم ہو گا حشر کو پینا شراب کا
ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے — پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں — کیجے جو آپ مجھ کو نہ مورد عتاب کا
تقوی ہی ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست — اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا
مے ہو سبو ہو کنج بلغ ہو ساقی ہو ماہوش — اور وہاں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شیخ بے حجاب — دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ منہ سے منہ
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیجیے
اُس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو

یہ ریشِ حسیں پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا
گر پی نہ جائے جلا یہ ساغرِ شراب کا
گر کچھ بھی خوف کیجیے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

(۶۷)

عجب دھوکے کی یہ تعمیر خراب آباد ہستی ہے
ذرا دیکھو مجھے اے ساکنانِ ملکِ ہستی ہے
ہر اک دل میں ہوائے پیروی ہے نقشِ کافر کی
حصولِ جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
گُلوں کا ہے گریباں چاک سنتے جو سحر سے

کہ پستی یاں بلندی ہے بلندی یاں کی پستی ہے
عدم کی راہ سیدھی ہے بلندی ہے نہ پستی ہے
خدا کے گھر میں ہے ہے دیکھیے کیا بت پرستی ہے
ہماری سعی باطل ہو گئی کہ تقدیر ہنستی ہے
صبا مضطر سی ہے اور گرہِ بندِ غنچوں کی کستی ہے

سمجھ ہر ایک کو ہشیار ہم آئے تھے یاں اختر
بچشمِ غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

(۲۴) امانت ۱۸۵۹ء

میر آغا حسن خلف میر آغا حسین رضوی لکھنوی۔ آپ سید علی رضوی کی اولاد سے تھے
سنہ ۱۲۳۱ھ میں حضرت امانت کی ولادت ہوئی فنِ شعر میں لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو سے استفادہ

حاصل کیا۔ ابتدا میں معمے اور چیستان کہنے کا شوق ہوا مگر اس فن میں پورے نہ اُترے تو دیگر اصناف سخن کی طرف توجہ فرمائی۔ رعایت لفظی اور ضلع جگت کے عاشق تھے لکھنؤ کی قدیم سوسائٹی ضلع و بدائع کو شاعری کا اصلی جوہر سمجھتی تھی اس میں آپ نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ یوں تو آپ صاحب دیوان ہیں جملہ اصناف سخن پر قادر ہیں مرثیہ گوئی میں بھی اپنی طباعی دکھائی ہے لیکن ان کی اندر سبھا کو اُردو لٹریچر میں جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ کہنا ذرا بھی بیجا نہیں کہ آپ نے اُردو زبان میں اس کتاب کو لکھ کر سب سے پہلے ڈرامے کی بنیاد ڈالی ہے اُردو متقدمین میں اس نمونہ کی ایک نظم بھی نہیں ملتی حضرت امانت نے ۸ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۵ھ کو وفات پائی۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

(۶۸) غزل

بھولا ہوں میں عالم کو سرشار اسے کہتے ہیں
مستی سے نہیں غافل ہشیار اسے کہتے ہیں

کل گھر سے جو وہ نکلا اک شور ہوا برپا
دل بس گئے عالم کے رفتار اسے کہتے ہیں

تصویر کو سکتہ ہے کہتے ہیں اسے نقشہ
آئینے کو حیرت ہے رخسار اسے کہتے ہیں

اک رشتۂ الفت میں گردن ہے ہزاروں کی
تسبیح اسے کہتے ہیں زنّار اسے کہتے ہیں

دل نے شب فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا
مونس اسے کہتے ہیں غمخوار اسے کہتے ہیں

اک قطرہ نہیں مے کا میخانہ میں اے ساقی
خم کر دیئے سب خالی میخوار اسے کہتے ہیں

دل ہجر کی شب غش ہے بیدار رہی چشم اپنی
بے ہوشی اسے کہتے ہیں ہشیار اسے کہتے ہیں

خاموش امانت ہے کچھ اُف بھی نہیں کرتا
کیا کیا نہیں اے پیارے اغیار سے کہتے ہیں

(۲۵) نسیم سنہ ۱۸۶۰ء

منشی دیا شنکر لکھنوی ولد گنگا پرشاد پنڈت کشمیری آپ خواجہ آتش مرحوم کے شاگردوں میں سے تھے مثنوی گلزار نسیم آپ کی مشہور تصنیف ہے جو ۱۸۳۳ء میں نظم کی گئی تھی گو اس کا پلاٹ نہاری کے ایک پرانے قصے سے لیا گیا ہے مگر انداز بیان نہایت دلکش ہے چھوٹی بحر اور مختصر الفاظ میں اہم مضامین ادا کئے گئے ہیں حال میں مثنوی گلزار نسیم و میر حسن کے متعلق بابو برج نرائن چکبست اور مولوی عبدالحلیم شرر کے درمیان مباحثہ ہوا تھا۔ اس مباحثہ میں دونوں مثنویوں پر فن تنقید کے جوہر دکھائے گئے ہیں اس مثنوی کے علاوہ نسیم کا ایک دیوان بھی ملتا ہے مثنوی کا انتخاب یہ ہے :-

(۶۹) آوارہ ہونا بکاؤلی کا تلاشِ گُل میں

گُل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھل کھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غل سے — اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہُوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں؟ کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟ — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بُو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا۔ کدھر گیا گُل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
گلچیں کا جو ہاتھ ہو تو ٹوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار بُرا نہ تیرا چنگل — مُشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا بتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

(۲۶) ظفر سنہ ۱۸۶۲ء

محمد سراج الدین نام خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ تھے ولی عہدی میں ابو ظفر خطاب تھا

بہادر شاہ کے لقب سے اپنے باپ اکبر شاہ ثانی کے جانشین ہوئے تاریخ پیدائش ۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء مطابق ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ اور ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو تخت پر بیٹھے۔ زمانہ ولیعہدی سے شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے ابتدا میں شاہ نصیر اور پھر خاقانیٔ ہند ذوق دہلوی کے شاگرد ہوئے علمی قابلیت کے سوا فطری شاعر تھے غدر ۱۸۵۷ء منحوس واقعہ کے زمانہ میں جبکہ بادشاہی حکومت صرف دہلی میں ایک محدود رقبہ کے اندر باقی رہ گئی تھی پیش آیا تھا غدر کے فرو ہونے کے بعد ۱۸۵۸ء میں برٹش گورنمنٹ نے ان کو نظر بند کر کے کلکتہ بھیج دیا تھا وہاں سے رنگون کو منتقل ہو گئے اور اپنی عمر کے بقیہ انفاس وہیں گزارے۔ شاعری کا شغل وہاں بھی جاری رہا سوز و گداز ناکامی و محرومی کی درد بھری داستانوں کو مختصر الفاظ میں نظم کرنا انھیں کا حصہ تھا ظفر بنصیب تاجدار کے جیسے پُر خلیل القدر اسلاف کی مٹی ہوئی یادگاروں پر آخری نظر حسرت ڈالکر دہلی سے نکلنا نصیب ہوا ہو جسے گزشتہ اقبال و جاہ و جلال کے خوابوں پر گہری نظر ڈالنے کا موقع ملا ہو دماغ سے اس قسم کے خیالات نکلنے کے سوا دوسرے مضامین کی تلاش کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے چار دیوان چھوڑے جو مشہور عالم ہیں بمقام رنگون ۷ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۹ھ کو وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۷۷)

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے
شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے

جہاں بھرتے بگولے ہیں اڑتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت رقص کرتے سیمبر یاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور شہرِ خموشاں ہے
کبھی کیا کیا نہ ہنگامے تھے واں اور شور شہریاں تھے

جہاں اب خاک کے ہیں نقشِ پائے آہوئے صحرا
کبھی محوِ تماشا دیدۂ اہلِ نظر یاں تھے

ظفر احوالِ عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

(٨١)

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خردمند بنایا۔ نہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

دلِ صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن
زلفِ مشکیں کا ترے شانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اُس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

دمِ بسمل اے بتِ عشوہ گر خوشی عید کی سی ہوئی مجھے
خمِ تیغ تیرا جو سامنے نظر آیا مثلِ ہلال تھا

کہو اس تصورِ یار کو کہوں کیا میں خضر خجستہ پے
کہ یہی تو دشتِ فراق میں مجھے رہنمائے وصال تھا

مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پہ رنج و ملال ہے
وہ جب آگیا مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا

وہ ہمیشہ دنا وہ ہی پر جفا وہاں لطف کیسا وفا کہاں
فقط اپنا وہم و خیال تھا یہ خیال امرِ محال تھا

پس پردہ سُن کے تری صدا اثر اشتیاق دو بارہ جو بڑھ گیا
مجھے اضطراب کمال تھا یہی وجہ تھا یہی حال تھا

ظفر اس سے چھوٹ کے جو جستہ کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی
فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

(۷۳)

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا وہ جو پردہ بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ترے رخ کے خیال میں کون سے دن اُٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کونسی شب مرے سر پہ ہجوم بلا نہ رہا

ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

کئی روز میں آج وہ مہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اُسے پاس حجاب حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آب رواں ہوئی جبکہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں کوئی تشنۂ آب بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں رو رو کے خونِ جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر کفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے دوں
کئے لاکھ فریب کروڑ فسوں نہ رہا نہ رہا نہ رہا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اُس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(۲۷) نسیم دہلوی ۱۸۶۴ء

نواب اصغر علی خاں دہلوی خلف نواب آغا علی خاں۔ آپ مومن دہلوی کے ارشد تلامذہ سے تھے دہلی چھوڑنے کے بعد لکھنؤ سکونت اختیار کر لی تھی۔ عربی فارسی میں کافی استعداد تھی۔ فنِ خوشنویسی میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ کے کلام میں نازک خیالی مضمون آفرینی کے سوا زبان کی خوبیاں اور سادگی کا لطف بھی موجود ہے۔ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں وفات پائی الف لیلہ نظم اور دیوان آپ کی یادگار ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(۷۵) غزل

عروسِ فکرِ رنگیں کو خیال آیا جو تزئیں کا
شگوفہ خامہ سے شانہ بن گیا زلفِ مضامیں کا

بلا ملتی ہے بخشش سے بہا ہے چشمِ تر آنسو
لئے کچھ دامنِ خالی کو صدقہ روحِ غمگیں کا

بہار آئی جھکائے سر گلوں نے کیفِ مستی سے
پڑا ہے گردنِ ہر شاخِ تر پر ہاتھ گلچیں کا

لٹکتی مرغِ بسمل اور پھر جاتی ہے تابی
دلِ مضطر کو طعنہ ہو گیا ہے دامِ تسکیں کا

وہ سرعت تھی دعا کو مطلبِ بیتاب نے میرے
کہ ہر سو غلغلہ دفعتاً کیا شور یا آمیں کا

نسیم اب تک روانی اشتیاقِ سامعیں پر ہے
دکھایا لطف ہم نے ہر طرح سے طبعِ رنگیں کا

(۷۶)

فصلِ گل آئی ہے گل اور ہیں سامان نئے
میرے دامن میں ہیں تیرے دشت بیاباں ہیں نئے

سب یہ کافر ہیں حسینوں کی نہ سُن تو اے دل
چار زن یہ بھی دشمن ایماں ہوں گے

شکر ہو جائیں گے انجام کو اپنے شکوے
رنج کے خوف سے ہم ان کے ثنا خواں ہوں گے

کھنچے تیغ تامل ہے یہ کیوں بسم اللہ
سر جھکا دیں گے جو یاں بندۂ احساں ہوں گے

کس طرح جائیں گے مانع ہے ہمیں حرفِ مزاج
زلف پر خم ہے تو کچھ وہ بھی پریشاں ہوں گے

شوخیاں کرلے جنوں آج یہاں پر کل تو
خاک اُڑائے گی زمیں دشت بیاباں ہوں گے

گر یہ انجام ستم ہے تو نہ ہنس اے غافل
خون روئیں گے وہی زخم جو خنداں ہوں گے

یاد آئے گا پس مرگ ہمارا یہ کمال
حال کھل جائے گا جب خاک میں پنہاں ہوں گے

تجھ کو کر دیں گے خبر زہر بلی سینے کی
سر پٹکتے ترے در پر مرے ارماں ہوں گے

خانہ زادوں کو کہاں قیدِ محبت سے فراغ
ہم وہ بلبل ہیں یہیں خلدِ گلستاں ہوں گے

دم نکل جائے گا گر ہاتھ لگا اے جرّاح
وہ نہیں زخم جو شرمندۂ احساں ہوں گے

وہ ہر نخل کریں گے صفتِ گردِ نسیم
ہم پس مرگ بھی قربانِ گلستاں ہوں گے

(۴۸) ناظم ۱۸۶۵ء

نواب محمد یوسف علی خاں فردوس مکان خلف نواب محمد سعید خاں بہادر والی رامپور ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ کو مسند نشین ہوئے نواب صاحب مرحوم علوم عقلیہ کے ماہر منطق فلسفہ سے باخبر تھے طبیعت کو شاعری سے خاص طور پر مناسبت تھی۔ پہلے حکیم مومن خاں مومن دہلوی سے

مشورۂ سخن رکھتے تھے اس کے بعد میرزا غالب کے شاگرد ہو گئے اسی زمانہ میں عاشقانہ دیوان مرتب ہو کر مطبع حسینی رامپور میں طبع ہوا تھا ۱۲ اپریل ۱۸۶۶ء مطابق ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی۔ انتخاب کلام یہ ہے:-

کیا ہوا سرو قامتو؟ اب نہ تمھارا خم و چم
کیا ہوا لالہ رخو؟ اب وہ تمھارا عالم
کہو کیوں چھوٹ گئی مشق جفا کاری کی
کہو کیوں ٹوٹ گیا سلسلۂ جور و ستم
کھنچتے کیوں نہیں اب میان سے تم خنجرِ ناز
دیکھتے کیوں نہیں اب تیغِ ادا کا دم خم
کچھ نہ عشاق سے مطلب ہے نہ اغیار سے کام
نہ ادھر چشمِ غضب ہے نہ ادھر چشمِ کرم
چین کیوں کر تمھیں آغوشِ لحد میں آیا
تم تو آغوشِ تصور میں بھی لیتے نہ تھے دم
کیا گزرتی ہے تہہ خاک تمھارے سر پر
فرش پر تم تو نزاکت سے نہ رکھتے تھے قدم
نازنینو! وہ نزاکت کہو کس نے لے لی؟

سچ بتاؤ تمھیں اپنی ہی نزاکت کی قسم
صحن تک تھا تمھیں دالان سے آنا مشکل
کس طرح طے ہوئی راہِ سفرِ ملکِ عدم
ناز و انداز و ادا عشوے کرشمے غمزے
خاک میں مل گئے سب ہائے ستم ہائے ستم
ہائے وہ ابروئے خمدار وہ مژگانِ دراز
ہائے وہ چشمِ فسوں گر کی ادائیں پیہم
ہائے وہ چینِ جبیں شوخی و انداز کے ساتھ
ہائے وہ ناز سے تیور کا بدلنا ہر دم
ہائے وہ شعلۂ رخسار کی غصے میں بھڑک
ہائے وہ گیسوئے پُر پیچ کا ہونا برہم
ہائے وہ فتنۂ محشر کی روش سے چلنا
ہائے وہ چھاگلیں پہنے ہوئے پھرنا چھم چھم

وا دریغا نہ رہی ایک بھی صورت باقی
بہر عبرت ہے زبانوں پہ حکایت باقی

(۲۹) رشک ۱۸۶۷ء

میر علی اوسط خلف میر سلیمان، آپ فیض آباد کے باشندے تھے۔ شاعری میں حضرت ناسخ لکھنوی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ محاورات کی چھان بین اور لغات کی تحقیقات کا شوق تھا۔ نفس اللغۃ ان کی مشہور تصنیف ہے۔ تاریخ گوئی میں اچھی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ صاحب دیوان تھے۔ ان کا دیوان کمیاب ہے۔ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں ۷۰ سال کی عمر پا کر انتقال کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

(۶۷) غزل

جو روح کو نہ ہیں ہم تجھ کو یہ ملے گا — لکھوا لیں گے نامہ تو کبھی تر نہ ملے گا
جس رات نقاب اس مہ کامل نے الٹ دی — تاروں کو نشانِ مہ انور نہ ملے گا
اب شب فرقت ہو بند آنسوؤں کا تار — اس طرح کا تو تار گہر تر نہ ملے گا
کاہیدگی جسم اگر یونہی رہے گی — ہم کو بھی ہمارا تن لاغر نہ ملے گا
انصاف کو سمجھو خضر راہ ہدایت — اے رشک اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

(۳۰) آزردہ ۱۸۶۸ء

مفتی صدرالدین خاں خلف الرشید مولوی لطف اللہ کشمیری، مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے رشید شاگرد تھے۔ اپنے زمانہ کے علماء اور فضلا میں ممتاز تھے۔ ذوق

مومن۔ غالب۔ صہبائی کے ہمعصر اور دوست تھے۔ دہلی میں عہدۂ صدر الصدوری کی خدمات ان کے سپرد تھیں۔ جب مفتی صاحب کے اجلاس میں حضرت غالب مرحوم نے یہ شعر بطور جواب پڑھا کہ ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اُنھوں نے اس شعر کو سُن کر اُن کے قرضہ کا روپیہ اپنی گرہ سے ادا کر دیا۔ آپ نے ایک تذکرۂ شعرائے ریختہ بھی ترتیب دیا تھا جو اس زمانہ میں دستیاب نہیں ہوتا۔ مفتی صاحب ایک جید عالم اور عربی زبان کے فاضل تھے۔ مگر نہایت صاف اور پُر لطف شعر لکھتے تھے۔ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں رحلت فرمائی۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(۷۸)

یہ کہہ کے رخنے ڈالیئے اُن کے حجاب میں — اچھے بُرے کا حال کھلے کیا نقاب میں
یارب وہ خواب حق میں مرے خوابِ مرگ ہو — آئے وہ مستِ خواب اگر میرے خواب میں
حال اُس نگہ کا اس کے سراپا میں کیا کہوں — مورِ ضعیف پھنس گئی جا شہدِ ناب میں
یارب یہ کس نے چہرہ سے اُلٹا نقاب ہے — شعلے رخ سے اب نکلنے لگے آفتاب میں
خورشید زار رہتے ہیں زمیں سے جھک ذرا — شعلے آفتاب ہیں تری گردِ نقاب میں
کیا عقل محتسب کی کہ لایا ہے کھینچ کر — سودا زدوں کو محکمۂ احتساب میں
اُٹھتے ہیں صبح کے یہ کہاں سر گرانیاں — زاہد نے مے کا جلوہ یہ دیکھا ہے خواب میں

تحقیق ہو تجھ سے نہیں کیا ہے نفس کیا — لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

آ ہر روئیں سے خستے کے تیرے ہیں خوں چکاں — غوطے تو سو دیئے اسے زمزم کے آب میں

ہیں اور دو تین باتیں ہی یاد کی گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

اندازِ خشم کیا ہو لگے دل کو آگ جو — جلنے کے بعد خیر نہیں رہتا کباب میں

ہیں دونوں مثلِ شیشہ یہ سامانِ شکست — جیسا ہے نیشے دل میں نہیں ہے حباب میں

یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں بھی تھیں عہدِ شباب میں

(۳۱) غالبؔ ۱۸۶۹ء

اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء کو بمقام آگرہ پیدا ہوئے شادی ہونے کے بعد میرزا صاحب نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور ۷۳ برس کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ کو انتقال کیا۔ جوار حضرت نظام الدین اولیا میں چونسٹھ کھمبا کے قریب ایک حریم میں دفن ہوئے فارسی کی نظم و نثر کے مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے ہیں۔ اردو انشا پردازی کی طرز جدید کے بانی تھے ماہرین سخن کا قول ہے کہ ہندوستان میں شاعری کا آغاز امیر خسرو سے ہوا اور اس کا خاتمہ میرزا غالب پر ہو گیا پنج آہنگ، مہر نیم روز وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں علاوہ فارسی کلیات کے دیوان اردو بھی موجود ہے جو اکثر مطابع کا چھاپا ہوا بکتا ہے

۱۹۱۵ء میں ایک خاص ایڈیشن نہایت اہتمام اور جلی قلم عمدہ کاغذ پر مرزا کے خود
کے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں اسی پریس نے ایک
عمدہ شرح[۱] ایڈیشن نکالا۔ اسی شرح نظامی کے ساتھ کئی پاکٹ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جن میں
علاوہ مرزا کے فوٹو کے اُن کی تحریر کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ اس اُردو دیوان کی شرح
مولانا طباطبائی اور حسرت نے بھی لکھی ہے۔ مرزا کا کلام آج کل کے تعلیم یافتہ گروہ میں بڑی
دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ اخلاقی اور فلسفی مسائل سے بھرا ہوا ہے اور ان کے تخیل میں وہ
جدت پائی جاتی ہے جو کبھی پرانی ہونے والی نہیں۔ غالب کی طبیعت کو بعض لوگ دشوار پسند
کہتے ہیں لیکن جہاں کہیں اُنھوں نے سلاست کو برتا ہے روانی کے دریا بہا دیے ہیں۔
اُردو زبان پر مرزا کا بڑا احسان ہے کہ نثر میں مراسلے کو مکالمہ بنا کر خطوط نویسی کی
ایک جدید طرز نکالی اور نظم میں ایسے اسلوب بیان کا نمونہ چھوڑا کہ ان کے نقشِ قدم
پر چل کر موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ شعرا کو قدرت کے نقش و نگار، سیاسی خیالات، فلسفیانہ
تجربہ کا نظم کے ذریعے سے ظاہر کرنا آسان ہو گیا۔ غالب کے حالات اور سوانح میں مولانا حالی
کی مبسوط تصنیف یادگارِ غالب موجود ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

(۹۷) غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا	اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا	کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

[۱] شرح مولانا نظامی نے لکھی ہے۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ۔ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو ۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ۔ جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ۔ غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے ۔ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ۔ نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ۔ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۶۰)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا ۔ نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

(۶۱)

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(۸۳)

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ. درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دستِ بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت. درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

(۸۴)

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(۸۵)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا۔ کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں ای فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا؟ جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

(۸۶)

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی ای دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

(۸۶)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش! کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا۔ گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے۔ ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں۔ ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

(۸۷)

دل ہی تو ہے نہ سنگِ خشت۔ درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم۔ غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز۔ پردے میں مُنہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں۔ ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن۔ رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے۔ غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز۔ یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں۔ بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر۔ کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا۔ کیجئے ہائے ہائے کیا

(۸۹)

غنچۂ ناشگفتہ کو۔ دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں۔ منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیئے۔ ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے۔ پر نہ کرے خدا کہ یوں

"غیر سے رات کیا بنی"۔ یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا۔ اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اُس کے روبرو۔ کیوں نہ خموش بیٹھئے
اُس کی تو خامشی میں بھی۔ ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

مُجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی ۔ حیرتِ نقشِ پا کہ یوں
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیط آب میں ۔ مارے ہے دست و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

(۸۹)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں ۔ گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں ۔ جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ! دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب۔ پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

(۹۰)

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں

(۹۱)

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی
پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

(۹۲)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۹۳)

تپش سے میری. وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے. مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ. نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا. عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

(۹۴)

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی. مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

ادھر وہ بدگمانی ہے. ادھر یہ ناتوانی ہے

نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مُجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مُجھ سے

تکلّف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مُجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۹۵)

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے نزدیک
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گُل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلےٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے — آئی شب ہجراں کی تمنّا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا — غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۹۶)

ظُلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظّارۂ جمال — مُدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب — اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست — بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مُطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہی
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش ہی
لُطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ ۔ وہ فردوسِ گوش ہی
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و شور، نہ جوش و خروش ہی
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہی سو وہ بھی خموش ہی

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہی

(۹۷)

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہی — وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہی جو نہیں ہی حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

(۹۸) سہرا[۵]

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار
لائے گا تاب گراں باری گوہر سہرا

[۵] غالب نے یہ سہرا ابوظفر بہادر شاہ کے چھوٹے بیٹے جواں بخت کی شادی کے موقع پر لکھا تھا
مقطع کو سن کر بادشاہ نے خیال کیا کہ مقطع میں اس کے استاد ذوق پر تعریض کی گئی ہے چنانچہ
بادشاہ کے ایما سے استاد ذوق نے بھی اسی ردیف قافیہ میں ایک سہرا الگ لکھا جو یہ ہے
(ملاحظہ ہو صفحہ ۹۰ پر)

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

(۹۹) سہرا جو ذوق نے جواب میں لکھا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تلبے اور بھی ہیں یہ اخلاص بہم
گوندھے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہِ خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

(۱۰۰) قطعہ لہ

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مُدعا
جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

لہ مرزا نے اپنے سہرے کے جواب میں اُستاد ذوق کا سہرا سُن کر اس قطعے کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔

(۳۲) ثاقب ۱۸۶۹ء

شہاب الدین خاں خلف الرشید نواب ضیاء الدین خاں متخلص بہ نیّر رئیس لوہارو۔ دہلی کے نامور رؤسا میں تھے۔ مرزا غالب مرحوم کے عزیز تھے اور شاعری میں انہیں سے تلمذ تھا۔ آپ اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق رکھتے تھے۔ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرزا غالب کو ان کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی۔ بہ عالم جوانی ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ اُن کے بیٹے نواب شجاع الدین خاں تاباں اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل[۵] اس وقت موجود ہیں نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۰۱) غزل

ہم ثبوت جذب دل دکھائیں — اور پھر وہ ہمارے گھر نہ آئیں

کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں — کچھ حال سنو تو ہم سنائیں

اے بخت کہاں تلک برائی — اے چرخ کہاں تلک جفائیں

ہم سینہ سپر کئے کھڑے ہیں — وہ شوق سے خنجر آزمائیں

جو کام میں تیغ کے ہوئیں صرف — افسوس وہ دلربا ادائیں

شاید کہ ہے گرم نالہ ثاقب

جلتی ہیں شرر فشاں ہوائیں

۵ انتقال ہوگیا

(۱۰۲)

فکرِ وصال و ہجر کا صدمہ اُٹھایئے
بے لطف زندگی سے تو مرنا ہی خوب ہے

آؤ نہ آؤ ہم بھی ہیں جو گر شکیب کے
رکھتے ہیں لوگ خلوتِ دشمن کا اتہام

اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اُٹھایئے
کہ نازِ چارہ کہ نازِ مسیحا اُٹھایئے

جی چاہتا ہی ذوقِ تمنا اُٹھایئے
بے پردگی میں پردہ ہی پردہ اُٹھایئے

بیٹھے ہیں اب تو ہم دلِ بے آرزو لیئے
وہ دن گئے کہ داغِ تمنا اُٹھایئے

(۳۳) شیفتہ ۱۸۶۹ء

نواب محمد مصطفیٰ خاں خلف نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں بہادر رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر۔ آپ نواب ولی داد خاں مرحوم خاندان بنگش کی اولاد میں تھے ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے مشہور معلمین اور کاملین سے عربی فارسی پڑھی آپ کو علوم مروجہ میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل تھی۔ غدر سے پہلے دہلی میں مستقل سکونت تھی اور وہاں کی سوسائٹی سے بہرہ اندوز تھے ۱۸۵۷ء کے بعد سے جہانگیر آباد میں رہنے لگے اور شاعری کو خیرباد کہہ دی۔ آپ اردو کی طرح فارسی میں بھی زبردست شاعر اور صاحبِ دیوان تھے اور حسرتی تخلص کرتے تھے۔ حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی کے شاگرد تھے اور ان کی وفات کے بعد حضرت غالب سے مشورہ سخن رکھتے تھے دیوان

ریختہ میں حکمت۔ تصوف۔ اخلاق حسن و عشق کے جذبات اور ہر قسم کے مضامین موجود ہیں اور ہر موقع پر سنجیدگی اور متانت کا خیال رکھا ہے۔ ۱۲۵۰ھ میں آپ نے تذکرہ گلشن بیخار مرتب کیا تھا جس میں اردو شعراء کے حالات اور کلام درج ہے۔ اردو زبان کا یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں شعراء کے کلام پر آزادانہ رائے بھی دی گئی ہے آپ نے ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کا کلیات جس میں فارسی اردو کا کلام اور رقعات شیفتہ بزبان فارسی شامل ہیں مع مصنف کی سوانح عمری اور فارسی و اردو کے کلام پر ایک مبسوط تنقید کے مولانا نظامی بدایونی نے مرتب کیا ہے۔ جو نواب صاحب کے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم کے ایما سے نظامی پریس بدایوں میں نہایت اہتمام کے ساتھ چھپ کر ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

(۱۰۳) غزل

ساقی کو میکدہ میں سرِ نائے و نوش ہے | صوفی کو خانقاہ میں سرِ وجد و حال ہے
عاشق کو اضطراب ہے عجز و نیاز سے | معشوق کو غرور ہے غنج و دلال ہے
منظور ہے حکیم کو ہر شے کی معرفت | حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے
ہر کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہے | ہر بات منطقی کی مرادِ جدال ہے
اربابِ حکمتِ نظری کو عمل نہیں | اہل کلام کو ہوسِ قیل و قال ہے
جن کو کہ دستگاہ ہے فن نجوم میں | عمر ان کی صرف زائچۂ ماہ و سال ہے
ہیں بعض لوگ در پئے اسراف رات دن | بعضوں کو روز و شب سرِ توفیر مال ہے

بعضوں کو ہے مذاق میں فخرِ نسب لذیذ
بعضوں کو ذوق دعوئے فضل و کمال ہے

مفلس کو فکر ہے کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے
منعم غریقِ لجۂ بیمِ زوال ہے

جو ہیں مریضِ سیرِ چمن ان کو ہر دم ہیں
ذکرِ شجر کبھی کبھی فکرِ نہال ہے

جی میں کسی کے خواہشِ آرایشِ لباس
دل میں کسی کے حسرتِ جاہ و جلال ہے

کوئی طالب ہیں اشہبِ گلگوں نظیر کا
کوئی اسیرِ شوقِ شکارِ غزال ہے

کوئی فدائے قامتِ آفت خرام ہے
کوئی خرابِ نرگسِ جادو مثال ہے

ناحق کسی کو شکوہ کسی کو شکایتیں
بے وجہ کوئی خوش ہے کسی کو ملال ہے

کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھیے تو بہت کم خیال ہے

غزل (۱۰۴)

کل نغمہ گرچہ مطربِ جادو ترانہ تھا
ہوش و حواس و عقل و خرد کا پتا نہ تھا

یہ تھا کہ جائے شیب ہے جب تھا شباب میں
عہدِ شباب اور بتوں کا زمانہ تھا

معلوم ہے بناتے ہو ہر اک بہانے سے
قصداً نہ آئے رات حنا کا بہانہ تھا

حسرت سے اُس کے کوچہ کو کیونکر نہ دیکھیے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

کیا جی کڑھے نہیں ہے کہ مدارا میں وہ نہیں
البتہ ایک آن دلِ بے مدعا نہ تھا

ساقی کی بے رخی نشہ بات رات کو
مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

کچھ آج اُن کی بزم میں ٹھٹھا ہے بندہ و بیت
آلودہ مے سے دامنِ بادہ صبا نہ تھا

دشمن کے فعل کی تمھیں توجیہ کیا ضرور
تم سے فقط مجھے گلۂ دوستانہ تھا

کل شیفتہ سحر کو عجب حالِ خوش میں تھا
آنکھوں میں نشّہ اور لبوں پر ترانہ تھا

(۱۰۵) قطعہ

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز
تلوّن سے ہے تم کو مدعا کیا

کبھی مجھ پر عتابِ بے سبب کیوں
کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا

کبھی محفل میں وہ بے باکیاں کیوں
کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا

کبھی تمکین صولت آفریں کیوں
کبھی الطافِ جرأت آزما کیا

کبھی وہ طعنہ ہائے جاں گزا کیوں
کبھی یہ غمزہ ہائے جاں فزا کیا

کبھی شعروں سے میری نغمہ سازی
کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا

کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا
کہ کیا طاقت جو پوچھوں ہیں خطا کیا

کبھی اس دشمنی پر بہرِ تسکیں
بلے ہم جلوہ ہائے دل ربا کیا

یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلف
جواب اک مختصر مجھ کو دیا کیا

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

(۳۴) شوق ۱۸۷۱ء

حکیم تصدق حسین خاں صاحب۔ نواب میرزا آغا علی خاں لکھنوی صاحب تذکرہ سخن شعرا نے اُن کو آتش کا شاگرد لکھا ہی اس کے سوا اور کوئی تحقیق نہیں۔ زہر عشق۔ بہار عشق۔ فریب عشق۔ لذت عشق کے مُصنّف تھے۔ ان مثنویوں کو تصنیف ہوئے قریب ۶۰ سال کے گزرے۔ مثنوی زہر عشق کا سال تصنیف سنہ ۱۲۷۰ھ ہے۔ نجم دلربا ہی پیرا یہ ہوتا ہی طرز بیان سلیس ہی۔ لکھنؤ کے محاورات۔ روزمرہ بول چال۔ ضرب الامثال کے ساتھ ہی ساتھ جذبات کی تصویر خوب کھینچی ہی ان سب مثنویوں میں زہر عشق اپنے واقعہ کے لحاظ سے زیادہ دل گداز ہی۔ ایک موقعہ پر اس میں دُنیا کی بے ثباتی کا جو نقشہ دکھایا ہی خوب ہے تقریباً سنہ ۱۲۸۸ھ مطابق سنہ ۱۸۷۱ء میں انتقال ہوا۔ زہر عشق کا انتخاب یہ ہی۔

(۱۰۶)

اقربا میرے ہو گئے آگاہ — تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے ہو رہے ہیں آپس میں — بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس — پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس
جائے عبرت سرائے فانی ہی — مورد مرگ نوجوانی ہی
اونچے اونچے مکان تھے جن کے بڑے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اُس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو — صاحبِ نوبت و نشاں تھے وہ
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرتِ حورِ مہ جبیں نہ رہے — ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم — ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
کوئی بتا نہیں اب اُس کا نام — کون سی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے — اک فقط نام ہی نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج — آج وہ فاتحہ کو ہیں محتاج
تھے جو خود سر جہان میں مشہور — خاک میں مل گیا سب اُن کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور — باقی اُن کا نہیں نشانِ قبور
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں — کھا گئے اُن کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتا — نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا

بوئے اُلفت تمام پھیلی ہی | باقی اب قیس ہی نہ لیلیٰ ہی
صبح کو طائرانِ خوش الحان | پڑھتے ہیں کُل من علیہا فان
موت سے کس کو رستگاری ہی | آج وہ کل ہماری باری ہی
زندگی بے ثبات ہی اس میں | موت عین حیات ہی اس میں
ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم | تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو سمجھو لیوں میں بہلانا | یا مری قبر پر چلے آنا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور | ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی | ڈھونڈھتے کس طرف کو جائے گی
روکے رہنا بہت طبیعت کو | یاد رکھنا مری نصیحت کو
ضبط کرنا اگر ملال رہے | میری رسوائی کا خیال رہے
میرے مرنے کی جب خبر پانا | یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہو لیں سب اقربا جس دم | رکھنا اُس وقت تم وہاں یہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم | ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی | دور پہونچے گی میری رسوائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے | لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب امیر و غریب | قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
سہ اٹھانا ہو ہزار آفت کا | پاس رکھنا ہماری عزت کا

جب جنازہ مرا عزیز اُٹھائیں
آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں

میری مَنّت یہ دھیان رکھیے گا
بند اپنی زبان رکھیے گا

تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا
نام مُنہ سے نہ لیجیے گا مرا

اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا
ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا

آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے
سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے

رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں
مُنہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں

ساتھ چلنا نہ مر کے بال کھلے
تا کسی شخص پر نہ حال کھلے

ہوتے آتش کے ہیں یہ پر کالے
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

تذکرہ سُن کر مرا نہ رو دینا
میری عزت نہ یوں ڈبو دینا

رنج فرقت مرا اُٹھا لینا
جی کسی اور جا لگا لینا

رنج کرنا نہ میرا میں قربان
سُن لو اگر اپنی جان ہے تو جہاں

دل میں کُڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تم
جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تم

آ کے رو لینا میری قبر کے پاس
تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس

آنسو چپکے سے تو بہا لینا
قبر میری گلے لگا لینا

اگر آ جائے کچھ طبیعت پر
پڑھنا قرآن میری تربت پر

غنچۂ دل مرا کھِلا جانا
پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے
مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے — کون صاحب کسی کا ہوتا ہے
کبھی آ جائے گر ہمارا دھیان — جاننا ہم پہ ہو گئی قربان
دل میں کچھ آنے دیجیو نہ ملال — خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
مرگ کا کس کو انتظار نہیں — زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

(۳۵) نظام ۱۸۷۲ء

سید نظام علی شاہ خلف سید احمد شاہ۔ آپ ریاست رامپور کے سادات سے تھے۔ آزاد منش آشفتہ مزاج۔ رندانہ طبیعت رکھتے تھے۔ عاشقانہ معاملات کو خوب لکھتے تھے ابتدائی کلام شیخ علی بخش بیمار کو دکھایا۔ پھر نواب رامپور یوسف علی خاں بہادر ناظم سے اصلاح لی ۲۵ شعبان ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء کو وفات پائی دیوان مرنے کے بعد ریاست رامپور میں شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

(۱۰۰) غزل

جو عمر گزشت اپنی ہم کہیں گے۔ کوئی سنے گا تو کیا کریں گے
جو یاد آئیں گی تیری باتیں تو پہروں چپ ہم رہا کریں گے
الٰہی قاصد ابھی نہ آئے کہ یہ توقع بھی ہے غنیمت
کیا اگر انکار صاف اس نے تو دل کو تسکیں کیا کریں گے

عبث یہ ہر دم کا چونکنا ہے۔ عبث یہ اُٹھ اُٹھ کے دیکھنا ہے
بھلا وہ ایسے ہوئے تھے کس دن وہی تو وعدہ وفا کریں گے

یہ سچ ہے ناصح نہ ہوگا ملنا نہیں ہے اچھا نہ ہوگا اچھا
پھر آپ کو کیا، بُرا کریں گے تو اپنے حق میں بُرا کریں گے

نظام۔ تقریر پھر عبث ہے جواب کچھ اس کا دے سکو گے
وہ اُس کا ہر بات پر یہ کہنا کہ ہم تو اپنا کہا کریں گے

(۳۶) مہر سنہ ۱۸۶۳ء

میرزا حاتم علی خلف میرزا فیض علی قزلباش۔ آپ اکبر آباد کے مشہور رؤسا سے تھے۔ فن سخن میں شیخ امام بخش ناسخ کے تلمیذ رشید تھے۔ رعایت کے دلدادہ تشبیہات اور استعارات کے مرد میدان۔ میرزا غالب کے دوست تھے۔ غدر سے پہلے چھ برس منصف رہے ۱۸۷۲ء میں زندہ تھے۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(۱۰۸) غزل

گریباں ہاتھ میں ہے پاؤں میں صحرا کا داماں ہے
لب اپنے پاؤں میں اپنے اور ہر خار مغیلاں ہے

کہاں یہ ابروئے خمدار کب یہ چشم فتاں ہے
بیاضِ چشم آہویاں کتاب طاق نسیاں ہے

جلاتا ہے یہ پروانوں کو وصفِ شعلہ رویاں سے
زبانِ خامہ بھی اب تو زبانِ شمع سوزاں ہے

ہوائے دشتِ وحشت ہم کو لے اُڑتی ہی بنی ہی	ہمارا عنصرِ خاکی مگر ریگِ بیابان ہی
جسے اہلِ ریاضی برجِ آبی کہتے ہیں شاید	وہ سانچہ تیرے آنسو ڈھالنے کا چشمِ گریاں ہی
سبق کو دیکھتا ہوں رات بھر ادھیڑ الجھتا ہوں	مطولِ مختصر وہ شرحِ زلفِ پیچاں ہی

نہ کیوں ہر طرز میں بڑھتا غزل اس ماہ کے آگے
ہر استاد کامل مہر تاباں سا سخنداں ہی

(۳۷) دبیر ۱۸۷۴ء

دبیر میرزا سلامت علی۔ خلف میرزا غلام حسین ان کے آبا و اجداد کا وطن دہلی تھا مگر میرزا انیس ہی کی طرح ان کا بھی آفتاب سخن لکھنؤ میں طلوع ہوا۔ شاعری میں میر مظفر حسین صاحب ضمیر کے شاگرد تھے۔ مرثیہ گوئی میں میر انیس کے بالمقابل تھے اور اصل یہ ہے کہ دونوں آفتاب و ماہتاب تھے جس طرح میر انیس کی فصاحت مسلمہ ہی اسی طرح آپ کی بلاغت۔ ان کے مرثیے کئی جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۴ء کو انتقال فرمایا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۰۹) تلوار

جب مورچے پہ لیلیِ تیغ دو سر گئی	چنگلے کھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی
ہر صف میں خاک اُڑا کے ادھر سے اُدھر گئی	پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حُسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حُسن کا

آگے کبھی بڑھی۔ کبھی پیچھے کو پھر پڑی
تجویز جو لعینوں نے کی وہ مضر پڑی
سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی
اُفتاد اُن سے پوچھیے یہ جن کے سر پڑی

اُٹھی، گری، بلند ہوئی۔ پست ہو گئی
پی پی کے موذیوں کا لہو مست ہو گئی

(۱۱۰) رجز

ہم دل ہیں جیت آئیں گے فوجِ شریر کے
ٹکڑے کریں گے خنجر و شمشیر و تیر کے
جوہر کھلیں گے طاقتِ برنا و پیر کے
وارث ہیں ذوالفقار جنابِ امیر کے

اک اک کی موت آج حسامِ دوسرے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حکمِ قدر سے ہے

(۱۱۱) علی اصغر کی فرقت میں ماں کی بیتابی

بانو پچھلے پہر اصغر کے لیے روتی ہے
سر کو بھی پیٹتی ہے جاں کو بھی کھوتی ہے
ایک وہ جاگتی ہے خلقِ خدا سوتی ہے
پر عجب غم ہے کہ تسکین نہیں ہوتی ہے

پیٹتے پیٹتے بے ہوش جو ہو جاتی ہے
دل سے ہے ہے علی اصغر کی صدا آتی ہے

سوگ کا فرش ہے اور سامنے جلتا ہے چراغ
بازوؤں میں داغ رسن سینے میں اولاد کا داغ

جان اندوہ میں دل رنج میں آشفتہ دماغ
نہ وہ گل ہیں نہ وہ غنچے نہ ہرا زہرا کا وہ باغ
گوشہ چادر کا اگر میرے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفہ میں پھرنا اُسے یاد آتا ہے

ہائے اصغر نہ ترا دین ہوا چھُٹ سے ازا
نہ تری سال گرہ کی نہ ترا بیاہ کیا
بوجھ کوئی مری گردن سے نہ اُترا تیرا
نہ لحد تجھ کو ملی اور نہ کفن تجھ کو ملا
ذبح تم ہو گئے سینے پہ لٹاؤں کس کو؟
چھوٹے چھوٹے یہ سلوکے ہیں پنہاؤں کس کو

(۱۱۲) شیریں سید الشہدا کی یاد میں

شیریں کو عجب اُلفتِ اسلام اہم تھی
آنکھ اُس کی سوئے صورتِ بانوئے عجم تھی
ہر دم شہِ والا کی وہ مشتاقِ قدم تھی
پتلی صفتِ قبلہ نما سوئے حرم تھی
غش کرتی تھی اقرارِ امامِ دو جہاں پر
اس کی نہ خبر تھی کہ سر آئے گا سناں پر

ڈیوڑھی پہ سدا نور کے تڑکے اُسے آنا
گہ صبح سے مولا کے لئے فرش بچھانا
اور شام کو دروازے پہ لیٹے ہوئے جانا
اور شام کے نزدیک بصد یاس اُٹھانا
شہ کے لئے تیار کبھی کرتی غذا کو
مولا جو نہ آتے تو کھلا دیتی گدا کو

ناگاہ ہوا شاہ سے برگشتہ زمانا
جانے گیا اشرار نا پیمبر کا ستانا

مسلم کا مدینہ سے ہوا کوفہ کو آنا
آخر کو ہوئے شاہ بھی یثرب سے روانہ
واں نکلے نبی قبر سے اور شاہ وطن سے
یاں روح نکلنے لگی شیریں کے بدن سے

تقدیر وہاں در بدر آقا کو پھراتی
گھبرا کے کبھی کوہ سے نیچے اتر آتی
شیریں یہاں در پر کبھی آتی کبھی جاتی
رہ گیروں کو جا جا کے سر راہ سناتی
دنیا میں میں ہوں اور نہیں دنیا کی خبر ہے
لوگو تمہیں کچھ دلبر زہرا کی خبر ہے

پاتی جو نہ اُس نے خبر سبط پیمبرؐ
کچھ پی لیا کچھ کھا لیا جو آیا میسر
ذی حجہ سے ہوئی نازک لذات وہ مضطر
سونے کے لئے فرش و زمیں دونوں برابر
اندیشوں نے یہ حال کو تبدیل کیا تھا
پوشاک بدلنا بھی غرض چھوڑ دیا تھا

ہمسائیاں کہتی تھیں بنایا ہے یہ کیا حال
وہ کہتی تھی نیرنگ نظر آتا ہے امسال
پوشاک جو میلی ہے تو اُلجھے ہوئے ہیں بال
دریافت مجھی کو نہیں ہوتا مرا احوال
پوشاک کی کچھ مجھ کو خبر ہے نہ غذا کی
اللہ بس اب خیر کرے آلِ عبا کی

(۳۸) انیس ۱۸۷۵ء

میر ببر علی خلف میر مستحسن خلیق - میر حسن مُصنّف مثنوی سحر البیان کے پوتے تھے

بزرگوں کا اصلی وطن دہلی تھا مگر میر صاحب نے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے مراثی نے اردو زبان میں رزمیہ نظم کی کمی کو پورا کر دیا۔ اخلاقی خیالات داخلی خیالات نے اُن کی شاعری کا مرتبہ بلند کر دیا ہے۔ میرزا دبیر مرحوم ان کے ہمعصر تھے۔ دونوں باکمالوں نے اُردو نظم کی تاریخ میں ایک ایسا ہنگامہ برپا کر دیا تھا کہ "معنی یابی اور الفاظ پرستی" کی جنگ کہنا ذرا بھی بیجا نہیں۔ ان کے زمانہ میں اُردو ادب کے ترقی خواہوں میں دو فریق پیدا ہو گئے تھے جو انیسیئے اور دبیریئے کہلاتے تھے۔ انیس کے ماننے والے بے ساختہ پن اور سوز و گداز کے شیدائی تھے۔ دبیر کے پیرو شوکت الفاظ، مبالغہ، صنائع و بدائع کو شاعری کا حُسن سمجھتے تھے۔ شمس العلماء مولانا شبلی نے ان کے انتقال سے کم و بیش تیس سال کی مدت کے بعد ہمارے زمانہ میں موازنہ انیس و دبیر لکھ کر اس بحث کو کہ اردو شاعری کی اس خاص صنف میں ان دونوں شاعروں میں سے کس کا پایہ اونچا تھا تازہ کر دیا تھا اور انیس کے حق میں فیصلہ دے کر اُنھوں نے ان اعتراضات کی جو نساخ نے "طومار اغلاط" میں دبیر کے کلام پر کئے ہیں ایک حد تک تائید کی تھی لیکن مولوی نظیر حسن صاحب نے المیزان شائع کر کے ان دونوں باکمالوں کی بابت ایسی منصفانہ رائے کا اظہار کیا ہے جو ہم نے قائم کی ہے۔ مراثی انیس کا مجموعہ چار جلدوں میں نولکشور پریس لکھنؤ نے عرصہ ہوا شائع کر دیا تھا لیکن حال میں نئی ترتیب اور تصحیح کے ساتھ مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی نے مراثی انیس کو تین جلدوں میں مرتب کیا ہے جس کی پہلی جلد میں میر صاحب کی آخری عمر کا کلام ہے اور دوسری جلد میں زمانہ شباب کا اور تیسری جلد میں متوسط عمر کا کلام ہے جو نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکی ہیں

۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء کو میر صاحب نے انتقال کیا ۷۲ برس کی عمر پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۱۳) صبح

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم
مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا وہ سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

(۱۱۴) گرمی کی شدت

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے

آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب تھا شعلۂ جوالہ کا گماں — انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں — تہہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

(۱۱۵) تلوار

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی — ندی ادھر اک خوں کی ابلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی — پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی

ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

پہونچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا — ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھاتی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا — تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا

اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

(۱۱۶) مسافرت

دکھا دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے

منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

درماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر کبھی جو بیٹھیں تو اٹھاتا نہیں کوئی

(۱۱۷) سلام

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھائے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو ہم بچا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہِ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو
کبھی جو ہو گیا پھیرا صدا سنا کے چلے

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

(۱۱۸) اولاد

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر

لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گل تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاج دل مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی راح یہی روح یہی ہے

ماں باپ کا دل غنچہ خنداں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے
گل ہے یہ کہ گھر رشک گلستاں ہے اسی سے
آبادی کاشانہ انساں ہے اسی سے

کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ ہے وہ عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پرنور مکاں رہتا ہے جس سے
یہ ہے وہ نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ دُر ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

دولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہے
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے
ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے
گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے

دلبند ہے پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے
تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرام جگر قوت دل راحت جاں ہی
پیری میں یہ طاقت ہی کہ فرزند جواں ہی

وہ شی ہی کہ شیدا یہ کھڑی رہتی ہی جس سے
وہ لال ہی کہ ابر عطر بنی رہتی ہی جس سے

وہ چیز ہی راحت کی گھڑی رہتی ہی جس سے
وہ زر ہی یہ زر جان لڑی رہتی ہی جس سے

آرام جگر تاب تواں ساتھ ہی اس کے
پھرتا ہی جدھر رشتۂ جاں ساتھ ہی اس کے

(۱۱۹) سلام

مرا راز دل آشکارا نہیں
وہ گل ہوں خزاں ہی جس کا رنگ

وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں
وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور
وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

بہت تنگ حال دنیا نے دیں بازیاں
میں نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں

فقیروں کی مجلس ہی سب کو خدا
امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

سکندر کی خاطر بھی ہی سب باب
جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں

گئے پہنے نعلین واں مصطفیٰ
فرشتے کا جس جا گزارا نہیں

جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا
جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں

پھرے دوست جب گئی قبر بنا
کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں

گرے ڈگمگا کر زمیں پر حسین
زیں سے کسی نے اتارا نہیں

ترے صبر کے ہیں فدا یا حسین
چھری کے تلے دم بھی مارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروس سخن کو سنوارا نہیں

(۷۹) قلق سنہ ۱۸۸۰ء

خواجہ ارشد علی خاں بن خواجہ بہادر حسین فراق لکھنوی آپ خواجہ وزیر لکھنوی کے خواہر زادہ تھے. اور شعر گوئی میں انھیں سے تلمذ حاصل تھا اور وہ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے مصاحبین میں تھے جب ولی عہد کی شادی ہوئی تو انھیں خلعت دیا گیا مگر دربار شاہی سے خطاب عطا نہ ہوا خلعت کو زیب تن کرتے ہوئے فوراً یہ شعر پڑھا سہ

خلعت وزر سے تو سب کچھ ہیں سنوارا جاؤں
ایسی شادی میں قلق کہہ کے پکارا جاؤں

بادشاہ نے اسی وقت اُن کو آفتاب الدولہ کا خطاب عطا فرمایا اور دیگر مقربین سے زیادہ مرتبہ بلند کیا سنہ ۱۸۷۶ء میں زندہ تھے اس کے چند سال کے بعد سنہ ۱۸۸۰ء کے قریب انتقال ہوا. دیوان موجود ہے ایک مثنوی "طلسم الفت" چھوڑی. اس میں عشق و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں کھائی گئی ہیں جس کا ڈراما ہندوستان کی مشہور تھیٹریکل کمپنیاں اپنے

اپنے اسٹیج پر نہایت شوق سے کھیلتی ہیں۔ یورپ کے ڈراموں کا بہت اچھا حصّہ وہ سمجھا جاتا ہے جس میں کوئی ایکٹر تنہائی میں اپنے دل ہی میں آپ باتیں کرتے ہوئے دلی خیالات کا اظہار کرتا ہے جس کی مثال شکسپیر کے مشہور پلے ہیملٹ سے ملتی ہے "مثنوی طلسم اُلفت" میں بھی اس قسم کا سین نہایت بے مثل طریقے سے لکھا گیا ہے چنانچہ ہم نے اپنے انتخاب مثنوی میں اسی سین کو لیا ہے جہاں عالم آرا حالتِ انتظار میں اپنے دل سے باتیں کر رہی ہے جو حسبِ ذیل ہے :۔

(۱۲۰) مثنوی

حسرتِ دید بڑھتی جاتی ہے
متحمل جو ہو نہ سکتی تھی
ہم کو جانی بہت نہ ترساؤ
دل بہت بے قرار ہے اب تو
جو جو گزرے گی سب سہوں گی میں
مرضِ انتظار اے دلدار
گر مری زندگی میں آجاتے
حسرتِ دید تو نہ رہ جاتی
ایک دن یہ کسی مصاحب نے

وحشتِ عشق سر اُٹھاتی ہے
آپ ہی آپ پہروں بکتی تھی
اس قدر راستہ نہ دکھلاؤ
آنکھوں میں جان زار ہے اب تو
گو تلک منتظر رہوں گی میں
ہے کل امراض سے بڑا آزار
صورت اپنی ذرا دکھا جاتے
جو کہ کہنا تھا تم سے کہہ جاتی
باتوں باتوں میں کہہ دیا اُس سے

یہ کئی دن سے ہے خبر مشہور
کسی شہزادہ کا جہاز حضور

اس طرف کو کہیں سے آیا تھا
یاں تلک آنے بھی وہ نہ پایا تھا

کہ کچھ ایسی ہوا چلی ناساز
غرق اک دم میں ہو گیا وہ جہاز

سنتے ہی یہ سخن وہ کشتۂ غم
متوحش ہوئی کمال اُس دم

بولی گھبرا کے سچ کہو اے خوش خو
کہیں میرا ہی وہ نگار نہ ہو

نام کیا اُس قمر عذار کا تھا
رہنے والا وہ کس دیار کا تھا

(۱۲۱) غزل

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

وہ ظلم کرتے ہیں ہم پر تو لوگ کہتے ہیں
خدا بُروں سے نہ ڈالے معاملہ دل کا

خدا ہی خیر کرے رنگ آج بے ڈھب ہے
ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا

وہ رند ہوں کہ مجھے ہتکڑی ہی بیعت ہے
لگا ہے گیسوئے جاناں سے سلسلہ دل کا

بہار آتے ہی کنج قفس نصیب ہوا
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا

خدا کے سامنے اپنا ہے اے قلق انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا معاملہ دل کا

(۴۰) اسیر ۱۸۸۱ء

نام امیر الدولہ مدبر الملک سید مظفر علی خاں دلاور جنگ، قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے

رہنے والے تھے عربی میں جملہ علوم و فنون کی کتابیں علماء فرنگی محل سے پڑھی تھیں شاعری میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی سے تلمذ تھا۔ نصیر الدین حیدر شاہ کے عہدِ حکومت میں شاہی متوسل تھے۔ امجد علی شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ پھر واجد علی شاہ کی مصاحبت میں کئی برس گزرے اور کلکتہ میں ان کے ساتھ رہے۔ بعد ازاں ریاست رامپور میں چلے آئے۔ نہایت پُرگو کہنہ مشق نادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کی غزلیات میں اخلاقی مضامین زیادہ ہیں چھ دیوان چھوڑے آپ کا ایک فارسی دیوان بھی موجود ہے۔ علم عروض معانی و بیان سے کامل واقفیت تھی ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں بمقام رامپور انتقال کیا۔ کلام یہ ہے:-

(۱۲۲) غزل

آہ کس لب پر نہیں ہے داغ کب دل میں نہیں
کون سی شب ہے کہ گرمی اپنی محفل میں نہیں

بزم کی کثرت سے اندیشہ مرے دل میں نہیں
دل میں اُس کی ہے جگہ میرے جو محفل میں نہیں

پنجۂ مژگانِ تر نے یہ اُڑائیں دھجیاں
تار باقی ایک بھی دامانِ ساحل میں نہیں

خونِ ناحق کیا ہمارے داغ چھٹنے کا نہیں
تیغ میں ہوگا اگر دامانِ قاتل میں نہیں

پردہ دار چہرۂ یوسف نہیں ہے ہر نقاب
حسنِ لیلیٰ جلوہ گر ہر ایک محمل میں نہیں

نجد کا صحرا عجب صحرائے وحشت خیز ہے
قیس کیا لیلیٰ کو بھی آرام منزل میں نہیں

جس طرف جی چاہے گا میرا نکل جاؤں گا میں
سیکڑوں دروازے ہیں حلقے سلاسل میں نہیں

بند ہو گئی زلفِ سیاہِ یار کی ایسی ہوا
لاکھ شمعیں جل رہی ہیں نور محفل میں نہیں

گھر سے باہر پاؤں جو رکھتا ہے ہوتا ہے خراب
گھر میں جو راحت مسافر کو ہے منزل میں نہیں

ڈوبنے جاتے ہیں کیوں کر لوگ حیرت ہے مجھے
قطرۂ آبِ بجز تیغِ قاتل میں نہیں

ہم غریبوں کا خدا ہے ناخدا درکار کیا
طالبِ ملاح کشتی دستِ سائل میں نہیں

ہو گیا دہشت سے ایسا بسملوں کا خون خشک
ایک بھی دھبا لہو کا تیغِ قاتل میں نہیں

میرے زخموں کے لیے تیار ہو مرہم امیر
اس قدر زنگار بھی شمشیر قاتل میں نہیں

(۱۳) بیتاب ۱۸۱۹ء

بیتاب۔ اسمٰعیل حسین خلف بیتاب احمد حسین صاحب شاعر۔ بزرگوں کا اصلی وطن شکوہ آباد ضلع مین پوری تھا لیکن ان کا قیام عرصہ دراز تک لکھنؤ میں رہا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی بتقریب ملازمت کانپور و فرخ آباد میں بھی رہے۔ آخر زمانہ میں نواب کلب علی خاں کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے۔ رشک کے ارشد تلامذہ سے تھے: ناسخ سے بھی استفادہ سخن حاصل کیا تھا نیز آغاز شباب سے شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان کے کلام میں قدیم تخیل اور الفاظ پرستی کا رنگ نمایاں ہے لیکن نہایت پرگو اور مشاق شاعر تھے۔ پیدائش ۹ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء وفات ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں بمقام رامپور ہوئی۔ کلیات مطبوعہ ہے لیکن عام طور پر نہیں ملتی ان کی ایک مثنوی "معراج المضامین" کے نام سے زیادہ مشہور۔ کلام یہ ہے:-

(۱۳۳) غزل

آمد تصور بت بیداد گر کی ہے
دل کی بھی لوٹ خانہ خرابی جگر کی ہے

نزدیک صبح رخصت اہل نظر کی ہے
اب حسن یار چاندنی پچھلے پہر کی ہے

دنیا میں مثل کاغذ آتش زدہ ہیں لوگ
مہلت شرار آنکھ کو اک نظر کی ہے

بیری ہی صبح شام جوانی کے واسطے
مہمان شمعِ حسنِ بتاں رات بھر کی ہے

چاروں طرف کو اُٹھتے ہیں تیر اہلِ عشق کے
یارب ہوا دیارِ جنوں میں کدھر کی ہے

آنکھیں بچھی ہیں جال کے رستہ میں دور تک
آما قفس کی سمت یہ کس بشت پر کی ہے

تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں
یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہے

اک بار تیر مار کے اب تک خبر نہ لی
یارب نگاہِ مست یہ کس بیخبر کی ہے

آباد دل کی خانہ خرابی سے ہو گئے
بستی زمانے میں اسی ویران گھر کی ہے

گو رسم و راہ خنجرِ ابرو نے قطع کی
پر تھوڑی سی لگاوٹ ابھی یک نظر کی ہے

یہ رنگ و بو کہاں گلِ تر کو نصیب تھا
اتری ہوئی قبا کسی رشکِ قمر کی ہے

باقی ہے دل میں نوکِ مژہ کی ابھی کھٹک
یہ پھانس یادگار کسی نیشتر کی ہے

اطفالِ اشک تنگ ہیں کھل کھیلیں کس طرح
ای آستین تجھ میں جگہ ہاتھ بھر کی ہے

دلی بگڑ کے بن گئیں اکثر دلائیں
جس گھر میں دیکھو لوٹ اسی چور گھر کی ہے

فرمانِ حسنِ گرم کے تابع ہیں نرم دل
پنبہ جہاں کہیں ہے رعیت شرر کی ہے

نامِ سلوک سے ہیں اگر کان آشنا
آواز خضرِ راہ ہر اک جانور کی ہے

کر بیٹھیں ترکِ عشق ہم اپنے یا رہیں
مجبور ہیں کہ بیچ میں حیا بہت کمر کی ہے

رخصت طلب ہے عاشقوں سے حسنِ یار کا
پروانوں سے وداع چراغِ سحر کی ہے

آوارہ چھوڑ جاتی ہے جسم گلی کو روح
مٹی خراب گرد و غبارِ سفر کی ہے

یا منا اختلاط کہ سہل اب کی شاعری
تیزی نہ طبع کی ہے نہ قوت نظر کی ہے

کہتا یہ ہے کہ مرتے ہیں تم پر ہزار ہیں
جو عاشقانہ شعر ہے سرکش ہے حسن سے
خالی ہے حسن بندش و مضموں سے یک قلم
مرغوب ہے محاورہ ارباب شوق کا
موتی کے مول قطرۂ بے مایہ بکتے ہیں
پھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہو گی اس طرف

تلخی نہ زہر کی۔ نہ حلاوت شکر کی ہے
پر درد جو غزل ہے وہ دشمن اثر کا ہے
ہر ایک بیت کوٹھری مفلس کے گھر کی ہے
ہاں کس سے پر من جنس کمال و ہنر کی ہے
مٹی خراب آجکل آب گہر کی ہے
امید آج تک اسی پہلی نظر کی ہے

بزم سخن میں لطف جناب عروج سے
شہرت منیر اس غزل مختصر کی ہے

(۱۲۴)

وہ ہنر یک خونِ جگر سے خوش دلِ زار موجِ خطر سے خوش
کوئی میرے دیدۂ تر سے خوش ہیں کسی کی ترچھی نظر سے خوش
نہ تو سینہ آہِ سحر سے خوش۔ نہ فلک کی سیدھی نظر سے خوش
مرے کان تیری خبر سے خوش میری آنکھ حلقۂ در سے خوش
تری بو نہ لائی ادھر کبھی۔ مرے دل کی لی نہ خبر کبھی
صفت چراغ سحر کبھی۔ نہ ہوا نسیم سحر سے خوش
ترے سرخ کی ہو طلب جہاں وہیں اے فلک ہو گہر فشاں
کوئی طفل طبع نہیں یہاں جو ہو سیر رقص شرر سے خوش

نہ پھندہائے گیسوئے حُور اُسے نہ ہنسائے صبحِ سرور اُسے
نہ خوش آئے آتشِ طور اُسے جو ہو میرے دردِ جگر سے خوش

تہہ زلف ہوش ہوئے ہرن کھلے تیری آنکھوں کے مکر و فن
شب تار میں ہوئے راہزن مرے قافلے کے سفر سے خوش

پھرے جاؤں تیری وفا کا دم ہو اگرچہ سر بھی مرا قلم
نہ فراقِ جان و بدن کا غم نہ وصالِ گردن و سر سے خوش

کبھی تجھ پہ کوچۂ یار میں کبھی دل کے جیب و کنار میں
مرے اشک فصلِ بہار میں نہیں دامنِ گلِ تر سے خوش

فقط آبرو ہی نہ مجھ کو دو نگہِ غضب سے بھی کام لو
جسے آبِ تیغ کی پیاس ہو وہ ہو کیونکر آبِ گہر سے خوش

کروں دم میں قطعِ رہِ سفر نہ ہو غم عدم میں بھی بال بھر
اُسی تیغ سے مجھے ذبح کر جو رہی ہو قربِ کمر سے خوش

جسے حکمِ یار کا پاس ہے وہی رمزِ فقر شناس ہے
وہ دل آئینوں سے اُداس ہے نہ حصولِ گنجِ گہر سے خوش

چھُٹے دل سے سیرِ جہات کی کہ وہ ذاتِ حق کی ہو جان کی
نہ ہو تو بھی آپ کے کان کی خبر چراغِ سحر سے خوش

مرے دل میں داغِ وفا ہو جو اُسے لاکھ طرح کا رتبہ دو
نہ کفِ کلیم سے شاد ہو نہ رہے جبینِ قمر سے خوش
سوئے زُلف ہی نہ گزر کرے رگِ جاں میں بیچ کبھی گھر کرے
وہی پل نہ جو ادھر کرے جو ہو وصل ہوئے کمر سے خوش
یہ نہیں شبہ دل میں نہ ٹھانئے مرے ہونے کو مانیے
اگر آنکھ جھپکے تو جانئے کہ نہیں ہیں برقِ نظر سے خوش
نہیں معصیت کی کچھ انتہا کوئی کارِ نیک تو ہو بھلا
کریں اہلِ شہر کو لے دعا ہیں ہوا نہ دامنِ تر سے خوش
تپِ سوزِ غم کے مریض کو ہے تاب سے نہ سرور ہے
جلے اپنی آگ میں آپ جو وہ ہو کیونکر آتشِ تر سے خوش
مرے دل کی دیکھ کے بے بسی ہو شریکِ عالمِ بے بسی
لبِ گورِ زنگ رہے وہ ہنسی جو ہو مل کے زخمِ جگر سے خوش
کروں عیدِ شربتِ نزع کی جو دکھائیں شکل وہ چاند سی
رہیں آنکھیں خوابِ فنا میں بھی دمِ آخری کی نظر سے خوش

یہی زُلف میں ہے اسیر بھی یہی تیرے در کا فقیر بھی
دلِ بے قرار ہے مضطر بھی ہو کبھی کرم کی نظر سے خوش

(۱۲۴) رخشاں ۱۸۸۳ء

نواب ضیاء الدین خاں خلف فخر الدولہ احمد بخش خاں بہادر دہلوی فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص تھا۔ مرزا غالبؔ سے قرابت کے علاوہ تلمذ کی نسبت بھی تھی۔ دہلی کے اہل کمال میں آپ کا دم غنیمت تھا۔ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ شعر کے نقاد بھی۔ عامیانہ خیالات اور ٹکسال باہر محاورات کو اپنے کلام سے دور رکھتے تھے۔ علم تاریخ کے ماہر تھے اور گزشتہ واقعات سے جو نتائج مرتب کرتے تھے وہ نہایت گراں مایہ اور قابل قدر ہوتے تھے۔ نواب صاحب نے ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں انتقال فرمایا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۲۵) غزل

بجلی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں ——— ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے ڈھلتے پہر ——— گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
تیرے غصے نے ایک دم میں کیا ——— مردہ دل صید پائمال ہمیں
دل میں مضمر ہے معنی باقی ——— کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالع یار سے نیّر رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وصال ہمیں

(۳۴۴) قدر ۱۸۸۳ء

مولوی غلام حسنین بلگرامی ولایت بیتہ خلف علی۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت زید شہید ابن امام زین العابدین سے ملتا ہے۔ بلگرام کے باشندے تھے ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ تشریف لائے اور وہاں علوم عربیہ حاصل کئے شاعری میں پہلے آپ سحر و برق سے اصلاح لیتے رہے ان دونوں کی وفات کے بعد شیخ امداد علی بحر اور شاہ تلامذہ حضرت ناسخ کے شاگرد ہوئے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد حضرت لکھنؤ سے دہلی چلے گئے اور مرزا غالب مرحوم سے استفادہ اٹھایا آخر میں سرکار آصفیہ میں ملازم ہو گئے تھے صنائع بدائع و عروض سے بخوبی واقف تھے۔ پنگل یعنی ہندی کا عروض جانتے تھے نوادر العروض اور اعجاز خسروی کا حاشیہ آپ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ کلیات شائع ہو چکی ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

(۱۱۴۱) غزل

خدا کو مانو ہنسی نہ جانو نہ میرے دل پر جفا کرو تم
ہلے گا عرش بریں کا پایہ ذرا تو خوف خدا کرو تم

زمانہ الٹا ہے کیا کرو تم تمہارا جو ہے وہ ادا کرو تم
وفا کریں ہم جفا کرو تم دعا کریں ہم دغا کرو تم

ہمر ورِ وصالت کہ رنجِ فرقت نہ والیٔ الفت کہ دردِ کلفت
نشانِ بوسہ کہ داغِ حسرت قبول ہی جو عطا کرو تم

ہمیں نے پہلے گلا کٹایا ہمیں نے قاتل تمہیں بنایا
ہمیں نے یہ رنگ سب جمایا ہمارے حق میں دعا کرو تم

ابھی کفن مردے پھاڑ ڈالیں ابھی ہزاروں سر نکالیں
ابھی جو محشر کی چل کے چالیں ذرا قیامت بپا کرو تم

(۱) جگر پلکوں پہ رکھا ور نہ جان قربان ہو لبوں تک
اب ایک سر ہے اُسے بھی لیکر قدم پہ اپنے فدا کرو تم

نباہ ہو گا اسی میں باہم رہے یہ دونوں طرف کا عالم
کہ بے تکلف نہ تم سے کچھ ہم نہ ہم سے شرم و حیا کرو تم

ہزار دل ہوں جو اے جفا جو دریغ تم سے نہیں ہیں ہر مو
اسیر گیسو قتیل ابرو شہید ناز و ادا کرو تم

لگا ہے دل ہم سے خیر بہتر رہیں جو اغیار بھی مکدر
ذرا نہیں اختیار جب پھر اُس کے بارے میں کیا کرو تم

ہماری شہ رگ پھڑک رہی ہے کہ روح اس میں اٹک رہی ہے
تمام گردن لٹک رہی ہے ابھی نہ خنجر جدا کرو تم

ہوئیں جگت آشنا نگاہیں۔ ہیں کفر و اسلام سب سے راہیں
ملو تم اس سے نہ جس کو چاہیں۔ نئے نئے آشنا کرو تم

ہمارے نالوں کو سن جو پاؤ یقیں ہے غش کھا کے لوٹ جاؤ
نہ لوٹ جاؤ نہ غش میں آؤ تو دو غضہ واہ واہ کرو تم

بہانا نہ بھٹکے ہتّے رہو تم بھلے ہو اب جو بڑے سہو تم
جو بوسہ لوں تو کیا کہو تم گلے لگا لوں تو کیا کرو تم

بجا ہے یہ جا امر اگلا تھا۔ تمہارا اس میں گناہ کیا تھا
یہ میری تقدیر میں لکھا تھا نہ مجھ پہ جور و جفا کرو تم

بتاؤ اے قادر کیا کہا تھا یہ ہی نتیجہ ہے عاشقی کا
غریب و بیکس ذلیل و رسوا خراب خستہ بھرا کرو تم

(۴۴) نواب شمہ ۱۸۸۷ء

نواب کلب علی خاں خلد آشیاں والی رام پور۔ نواب یوسف علی خاں کے صاحبزادے تھے شاعری میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ معقول و منقول کی تمام مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی سے پڑھی تھیں۔ آپ کے عہد میں رام پور مشرقی علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر فن کے کامل موجود رہتے تھے۔ اردو و فارسی دیوان چھوڑے۔ نہایت علم دوست اور شریف نواز تھے۔ تاریخ ولادت ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۳۵ء وفات

۲۷ر جمادی الآخر ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۳ر مارچ ۱۸۸۷ء نمونہ کلام یہ ہے:-

ہلے کیونکر نہ تیری رہ گزر کی سر زمیں برسوں
کہ نالوں سے مرے کانپا کیا عرشِ بریں برسوں
بھلا کیا خاک سوئے چین سے وہ رنج مرقد میں
رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوشِ نازنیں برسوں
تری صورت کا نقشہ جب کبھی کھنچ جائے گا پورا
تو صنعت پر کرے گا ناز صورت آفریں برسوں
عجب حسرت سے دیکھا ہے سوئے جاناں دمِ آخر
رہے گی یاد اس کو بھی نگاہِ واپسیں برسوں
اڑائیں دھجیاں باتوں نے اس کی جوشِ وحشت سے
رہی تھی دیدۂ خونبار پر جو آستیں برسوں
کیا عشقِ کمر نے بے نشاں ایسا نہ پائیں گے
عدم میں بھی اگر ڈھونڈیں گے مجھ کو ہم نشیں برسوں
رفاقت لذتِ زخمِ جگر تیری ہی جب جانوں
کہ مرقد میں بھی میرے منہ سے نکلے آفریں برسوں

ہوئے ہوں گے کسی سے وصل کے اقرار بھی شاید
رہی ہے تو اُس بے رحم کافر کی نہیں برسوں

نصیبوں میں جو لکھی ہے بُرائی وہ نہ جائے گی
اگر رگڑوں گا در پر کعبہ کے نقشِ جبیں برسوں

اسیرِ دامِ گیسو دل ہوا تو یوں بھی وحشت ہے
نہ چھوڑوں گا کبھی ہاتھوں سے زلفِ عنبریں برسوں

اسی اُمید پر شاید کسی دن آؤ تم باہر
نہ جائیں گے تمہارے در سے دم بھر کو کہیں برسوں

جفا سے اس کی ٹھہرے گا نہ اے نواب کوئی بھی
رہیں گے دیکھ لینا کوئے جاناں میں ہمیں برسوں

(۸۵) حیاؔ ۱۸۸۷ء

شاہزادہ مرزا رحیم الدین خلف مرزا کریم الدین رسا نبیرہ شاہ عالم ثانی سنہ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے شاعری میں حضرت شاہ نصیر اور ذوق سے تلمذ تھا۔ ذہین طباع اور نازک خیال شاعر تھے۔ شطرنج کھیلنے میں مشہور تھے۔ ولایت سے جتنے شطرنج کے نقشے آتے تھے۔ ان کو حل کرنا آپ کا کام تھا۔ داغؔ و امیرؔ کے معاصر تھے۔ نواب کلب علی خاں خلد آشیاں والیٔ رام پور کے مصاحبوں میں داخل تھے۔ سنہ ۱۳۰۴ھ مطابق سنہ ۱۸۸۷ء دنیا سے رخصت

ہو گئے ۷۹ سال کی عمر پائی۔ ان کا دیوان صاحبزادہ محمود علی خاں رامپوری نے چھپوایا تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

(۱۲۸) غزل

موت ہی چارہ سازِ فرقت ہے
رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے

ہدفِ تیر لوحِ تربت ہے
بعد مردن بھی یہ عداوت ہے

ہو چکا وصل وقتِ رخصت ہے
اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے

وہ نہ کی داد کون دیوے گا
ظلم کرنا تمھاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہے رخصت بدوش
ہر نفس بانگِ گجر رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے
دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حبیب کو دیکھ آؤ
آج اس کی کچھ اور حالت ہے

(۴۶) اختر ۱۸۸۷ء

واجد علی شاہ (والیٔ اودھ) آپ امجد علی شاہ کے خلفِ اکبر تھے ۱۸۴۷ء میں مسند نشین

ہوئے۔ آپ کی طبیعت نہایت عیش پسند واقع ہوئی تھی۔ فیاض بھی تھے ۱۸۵۶ء میں اودھ کی سلطنت کا انتظام گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آپ کو نظر بند کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس حالت میں بھی عیش و نشاط کے ٹھاٹھ یا گذشتہ فیاضی میں فرق نہ آنے دیا۔ ۲۳ محرم ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں وفات پائی۔ علما و شعرا کے قدر دان تھے۔ شاعری میں جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ دیوانوں کے علاوہ آپ کی مثنویاں قابل دید ہیں جن میں اپنے کارناموں کو آزادانہ طریقے سے کھلے ہوئے الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔ فن موسیقی کے دلدادہ تھے۔ بطور نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۱۲۹)

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
وحشتِ دل کا جو ساماں نہ ہوا تھا سو ہوا

رُخ ترا آتشِ سوزاں نہ ہوا تھا سو ہوا
دل مرا شمعِ شبستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ابر مجھ پر کبھی گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا
گھر کبھی خانۂ زنداں نہ ہوا تھا سو ہوا

چمنِ عشق بیاباں نہ ہوا تھا سو ہوا
زخمِ دل خوردہ نمکداں نہ ہوا تھا سو ہوا

زرد رنگِ رخِ جاناں نہ ہوا تھا سو ہوا
دل کبھی طفلِ دبستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

یا خدا دیر میں ساماں نہ ہوا تھا سو ہوا
کافرِ عشق مسلماں نہ ہوا تھا سو ہوا

جور چہ گنبدِ گرداں نہ ہوا تھا سو ہوا
دل کبھی گنجِ شہیداں نہ ہوا تھا سو ہوا

رُخِ انور سحر میں حیراں نہ ہوا تھا سو ہوا
کبھی اے زلف پریشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ظلم و جور ای شب ہجراں نہ ہوا تھا سو ہوا	خانہ گور میں مہماں نہ ہوا تھا سو ہوا
چشم انصاف سے طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا دل اختر چمنستاں نہ ہوا تھا سو ہوا	

(۴۷) ادیب ۱۸۹۱ء

مولوی سیف الحق ولد مولوی احسان الحق دہلوی سنہ ۱۲۶۲ھ مطابق سنہ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی ان کے مورث اعلیٰ تھے عربی فارسی اور تھوڑی سی انگریزی جانتے تھے۔ فن سخن میں حضرت غالب کے شاگرد تھے شاعری کے علاوہ زبردست انشا پرداز تھے سنہ ۱۸۸۲ء میں ہیو رگزنٹ دہلی کے ایڈیٹر ہوئے اس کے بعد لاہور پہونچکر سنہ ۱۸۸۴ء میں رفیق ہند کے جواب میں شفیق ہند جاری کیا۔ رفیق ہند اس زمانہ میں جمہور مسلمین اور ان کے مسلمہ لیڈروں کی پالیسی سے الگ ہو کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے تھا اس کے ظرافت آمیز مضامین نے اس کی ہوا اکھیڑ دی آخر زمانہ میں ریاست حیدرآباد سے تعلق ملازمت ہو گیا تھا۔ میں بعمر ۴۵ سال سنہ ۱۳۰۹ھ مطابق سنہ ۱۸۹۱ء میں انتقال ہو گیا کلام کے جمع کرنے پر توجہ نہ تھی۔ اس لئے کوئی دیوان موجود نہیں ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

غزل (۱۳۰)

دولتِ اشک نظر آتا ہے قلزم مجھ کو
جستجو خاک کی ہے بہرِ تیمم مجھ کو

خود پسندی نے مجھے اور نہیں کیا کیا
کیوں مری طرح سے آتے ہو نظر تم مجھ کو

بحرِ مواج میں قطرہ کا تماشا دیکھو
ناخدا چھوڑ چلا ہے سرِ قلزم مجھ کو

خوگرِ جور رہوں الطافِ محبت معلوم
میں نہیں غیر کہ ہو لطف و ترحم مجھ کو

دل ہی خاموشی کو اک حضرِ تعلق جانا
نہ بن آئی کوئی جب طرزِ تکلم مجھ کو

دل میں برداشت نہیں تنگ دلی کا ہے قصور
آپ کا لطف گوارا نہ ترحم مجھ کو

کام مگر سے نظر آتے ہیں جب ہی کہ کہا
محو ہے دل ترے اے یار تکلم مجھ کو

موجِ دریا کی حقیقت بھی کھلی بارے ادیب
جوشِ گریہ نے دکھایا جو تلاطم مجھ کو

(۴۸) صفا رامپوری سنہ ۱۸۹۳ء

صاحبزادہ محمد صفدر علی خاں خلف نواب محمد سعید خاں والی رامپور آپ رامپور کے صاحبزادوں میں خوش گو۔ عالی فکر شاعر تھے۔ حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے طبیعت میں شوخی مضامین میں گرمی ہے۔ آپ کا دیوان مطبوعہ موجود ہے۔ جو شاعری کی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ زمانہ قتل جنرل اعظم الدین خاں سنہ ۱۸۹۱ء میں وارد کلکتہ تھے

اُس کے دو سال کے بعد وہیں انتقال ہوا۔ تاریخ انتقال ۲۲ جمادی الآخر ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۷ جنوری ۱۸۹۳ء ہے۔ ۱۸ جنوری کو رامپور میں دفن ہوئے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

(۱۳۱) غزل

تھا شکایت کا جو اُن سے حوصلہ جاتا رہا
رہا منا جب ہو گیا اسرار گلہ جاتا رہا

فصلِ گل میں بیڑیاں کاٹیں عبث ڈھایا گیا
تھا جو ہمرکاب جنوں سے سلسلہ جاتا رہا

وائے قسمت بے خودی میں کھو گئی تصویرِ یار
دل کے بہلانے کا یہ بھی مشغلہ جاتا رہا

اس قدر فاصلے میں ہم نے سمجھا عشق میں
دل لگانے کا کسی سے حوصلہ جاتا رہا

جام ٹوٹے اپنے دورِ چرخِ مینا رنگ ہو
محتسب کا شکوہ قاضی کا گلہ جاتا رہا

تھیں وہ ساری وحشتیں جوشِ جنوں کا کہاں
سر سے وہ سودا وہ دل سے ولولہ جاتا رہا

دشمنوں کے ہاتھ سے صدمے اٹھائے ہم نے قاسم
دل کو اپنے دشمنوں کا بھی گلہ جاتا رہا

عہدِ پیری میں کہاں عنفوانِ جوانی کے سے رنگ
وہ بہار آخر ہوئی وہ ولولہ جاتا رہا

(۴۹) سکرنیز ۱۸۹۳ء

نواب حافظ عبدالعزیز خاں بریلوی خلف نواب سعادت یار خاں آپ حافظ الملک

حافظ رحمت خاں کے پوتوں میں تھے عربی فارسی میں مشرقی علوم کی تکمیل کی تھی سنسکرت بھی جانتے تھے ضلع بریلی کی عدالت میں وکالت کرتے تھے۔ آپ کی ایک کتاب مجالس العلوم کے نام سے شہرت پذیر ہے جس میں تمام علوم و فنون کا بیان ہے۔ دیوان فارسی و اردو ۱۸۹۲ء میں چھپ چکا ہے ۵ برس ۸ ماہ کی عمر پاکر ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۱۳۲)

یا خدا دل میں غمِ یار کی مہمانی ہے
شرم رکھ لے کہ بہت بے سر و سامانی ہے

عشق کا عیب چھپانے کو بنا ہوں مجنوں
پردۂ رازِ محبت مری عریانی ہے

اشکِ گلنار کی ہے عشق کے بازار میں قدر
قیمتی ہے وہی یاقوت جو رمانی ہے

راستے اور بھی ہیں ملکِ عدم کے لیکن
تیغ کے گھاٹ اتر جانے میں آسانی ہے

نقدِ جاں ہو دلِ مجروح میں کیونکر محفوظ
زخم کے چور سے دشوار نگہبانی ہے

عشق سینے میں بنا سوز تو آنکھوں میں سرشک
طرفہ شے ہے کہ کہیں آگ ہے کہیں پانی ہے

لائے ہو برہمیِ طبع ازل سے ہمراہ
چین ماتھے کی تمھارا خطِ پیشانی ہے

صدمہ پہونچا ہے مرے دل سے تنِ نازک کو
وصل کی شب یہ مجھے ان سے پشیمانی ہے

خرمنِ غنچۂ گل سینۂ بلبل ہے عزیز
کثرتِ زخم ہے چھالوں کی فراوانی ہے

(۵۰) فروغ ۱۸۹۳ء

شاہزادہ میرزا قیصر بخت دہلوی خلف میرزا آقا بخش صابر۔ میرزا جہان بخت کے زمانہ سے دہلی کو چھوڑ دیا تھا اور بنارس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ہمیشہ مومن و غالب و ذوق کے مشاعروں میں شریک رہتے تھے۔ شاعری میں اپنے والد کے شاگرد تھے مگر امام بخش صہبائی اور عبدالرحمن خاں صاحب احسان کو بھی اپنا کلام دکھاتے رہتے تھے۔ نہایت پُر مضمون اور معنی خیز اشعار کہتے تھے صاحبِ دیوان تھے سنہ ۱۳۱۱ھ مطابق سنہ ۱۸۹۳ء کے قریب انتقال ہوا۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۱۳) غزل

بڑھ گئی بعد مرے گرمیٔ وحشت میری
مثلِ سیماب گرہوں اُڑتی ہے تربت میری

آپ کا عشق بھی کیا قفل زباں بندی ہے
نہیں کھلتی جو زباں پر ہے شکایت میری

عکس آئینۂ دل میں ہے ترے قامت کا
میرے پہلو میں ہے موجود قیامت میری

عرشِ اعظم پہ زمیں کا سرِ عزت پہونچا
اس قدر بڑھ گئی عالم میں کی قدر میری

مجھ کو جز جامۂ وحشت کوئی جامہ نہ ملا
چشمِ آہو کی سیاہی ہوئی قسمت میری

ہے فروغ اپنا کلام آئینۂ غیب نما
کہ نظر آتی ہے اشعار میں فکرت میری

(۵۱) مذاق ۱۸۹۴ء

مولوی دلدار علی شاہ بدایونی۔ ان کا نام شیخ شاہ علی صدیقی۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ خاقانی ہند ذوق دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ذوق سے شاگردی تہہ کرتے وقت فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر استاد کو سنایا تھا:-

کیا کروں عرض اشتیاق اپنا
ذوق تھا بہر تلاش سخن کا

شعر کہنا غرض تھا شاق اپنا
کہ تخلص کیا مذاق اپنا

۱۱ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء کو بدایوں میں انتقال ہوا۔ انتقال سے بیس سال قبل عاشقانہ شعر کہنا چھوڑ دیا تھا۔ صرف نعت و منقبت لکھا کرتے تھے اور ذکر و شغل میں شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی اپنا دیوان مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ زمانہ شباب کے منتشر کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ انتقال کے بعد بعض شاگردوں نے آپ کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں ہر قسم کا کلام جو دستیاب ہو سکا داخل ہے۔ کتاب کلام دلدار علی مذاق کے نام سے بدایوں میں طبع ہوئی ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:-

(۱۳۱۲) غزل

جو گھر ہے حسن اپنی ہستی کا ۔ نہ وہ پری کا نہ حور عیں کا
نقاب اٹھنے نہ دے آتشیں کا تو جا نہ جل جائے جو دھوئیں کا

قلم کو زہرہ نہیں رقم کا۔ ہے دل میں دفتر بھرا الم کا
ورق ہے جو اس کتاب غم کا۔ وہ ایک دیوان ہے حزیں کا
تلاش دیر و حرم ہے بیجا۔ کہ جا بجا ہے وہ جلوہ فرما
جہاں پہ ڈھونڈا وہیں پہ پایا۔ ہر ایک مکاں ہے اُسی مکیں کا
ہوا جو طفلِ سرشک پیدا۔ بنا وہ جا کے ہمیں رشک نگیں کا
کیا تھا کچھ ہم نے وقت گریہ۔ خیال اُس چشم سرمگیں کا

مذاق کہتا ہے یہ نکتہ دان سے۔ ثریا چھونے لا مکاں سے
کیا تھا تاریخ نے آسماں سے۔ بلند رتبہ گراں زمیں کا

(۵۷) فطرت ۱۸۹۴ء

سید حامد علی گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ ایشیائی شاعری میں مغربی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ مختلف عنوانوں پر نظمیں لکھتے تھے۔ ۲۴ سال کی عمر میں ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء کے قریب انتقال ہوگیا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۳۵) جلوۂ بیگانہ

جلوہ تیرا ارض و سما میں
شوخی تیری چشم حیا میں

قدرت تیری دستِ دعا میں
ٹھنڈک تیری باد صبا میں

رنگت تیری برگِ حنا ہیں
عصمت تیری چشمِ حیا ہیں

اے تو اور کرشمہ تیرا
پردۂ وحدت پردہ تیرا
ہر اک دل میں جلوہ تیرا
بزم تصور کمرہ تیرا

صورت پیاری نام خدا ہے
رنگ ترا لاڈھنگ بنا ہے

تو ہو ساقی بادۂ عرفاں
غمزے تیرے فتنۂ دوراں
بستی تیری شہر خموشاں
پرتو تیرے سارے خوباں

چشمِ موسیٰ خلوت تیری
سب سے اوجھل صورت تیری

بزم میں تیری ہو کا عالم
شانِ تکلم دستِ ماتم
محفل تیری چشمِ پُرنم
عاشق تیرے نالاں پُرغم

لطفِ محبت جس نے پایا
جی بھر کر کچھ لطف اُٹھایا

مستی تیری چشم ادا ہیں
آہٹ تیری بانگِ درا ہیں
ہستی تیری رنگ فنا ہیں
قایم تجھ سے جان حیا ہیں

ہر اک رنگ میں تو ہی تو ہے
باغِ جہاں میں تیری بو ہے

پُر رونق ہے بزمِ وحدت
لکھے تیرے رمزِ حقیقت

ہے آباد تجھی سے جنت
کس کی روح میں اتنی قدرت

بے مُنہ ایسی باتیں فطرت
کچھ تو سوچو اپنی حقیقت

(۵۳) بیان ۱۹۰۰ء

سید مرتضیٰ امیر میرٹھ کے سادات عظام سے تھے۔ نازک مزاج ایسے تھے کہ چاند سورج کی روشنی برداشت نہ کر سکتے تھے چودہ برس کی عمر سے آخر وقت تک گوشہ تنہائی میں گزار دی۔ زبان دہلی کی تھا، مگر اجتہاد کا پہلو لئے ہوئے تھے اپنے ہمعصروں میں سے کسی کو کم خیال میں لاتے اور تھے بڑے مضمون آفریں۔ قدرت نے جدت طرازی کا مادہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی تصنیفات میں چھوٹا سا مجموعہ نعتیہ اور کچھ کلام عاشقانہ ہے "انیال شاعری کی الوداع" ان کا ایک مسدس مشہور ہے ۶۶ سال کی عمر پاکر ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں دار فانی سے سدھار گئے۔

نمونہ کلام حسب ذیل ہے

(۱۳۶)

امید سے خطاب

کلیسا میں بُت کی ادا بن گئی تو — حرم میں بہ تجلّۂ خدا بن گئی تو

یہ پردے کی ہے بات سن لے نہ کوئی — کہ پردے میں کیا جانے کیا بن گئی تو

لگائی ہے لَو تجھ سے چُھٹتے ہوؤں نے — اندھیرے گھروں کا دیا بن گئی تو

ہر اک رنج و غم کو کیا محو تو نے — ہر اک درد و دکھ کی دوا بن گئی تو

یہاں کے سوا تو نے سب سے نبھائی
یہیں آکے بس بے وفا بن گئی تو

انتخاب از "ایشیائی شاعری کی الوداع"

(۱۳۷) خصوصیاتِ گردش

سلاطین کا تابع رہا ہے زمانہ — ہوا جس طرف ان کا توسن روانہ

اُسے طابق النعل بالنعل جانا — نئی چال چلتا رہا ہے زمانہ

اگر کاخِ دولت کی نوبت نئی ہو
نوبت کا ڈنکا نیا گت نئی ہو

شہانِ سلف کی یگانگی کہاں ہے
جہاں کو قرار ایک پہلو کہاں ہے
وہ دِلی کہاں ہے وہ اُردو کہاں ہے
خدا کی مشیت یہ قابو کہاں ہے
ہٹے کاغذی ناؤ کے کھینے والے
گئے مُفت کی روٹیاں دینے والے

رہو گے ذلل میں گرفتار کب تک
نہ عُقبیٰ سے ہوگا سروکار کب تک
کھینچو گے تسبیح و زُنّار کب تک
رہے گی یہ دُنیائے غدار کب تک
جھکو جانبِ کعبہ چھوڑو بتوں کو
نہ تکبیر سمجھیں گے توڑو بتوں کو

مسافر ہے انسان بحرِ فنا کا
خطر ہے سفینوں کو موجِ بلا کا
سفر چاہیے دیکھ کر رُخ ہوا کا
کہا مان لو منتظم کے ناخدا کا
نہ کشتی سے گرداب میں گر پڑو تم
معلّم جا ٹھہر ٹھہر دیے ٹھہر پڑو تم

(۵۰۴) امیرؔ ۱۹۰۰ء

منشی امیر احمد مینائی۔ ولادت ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ بہ عہدِ شاہ نصیر الدین حیدر بمقام لکھنؤ۔ وفات ۱۹ رجمادی الآخر ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء بمقام

حیدرآباد دکن۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید منظفر علی خاں امیر لکھنوی کے قابل فخر شاگرد ہیں اور بعد وفات استاد کے شعرائے لکھنوی میں بجائے خود استاد و یادگار سلف مانے جاتے تھے۔ اُن کی اور جلال کی وفات نے لکھنؤ کے معمر کہنہ مشق شعراء کا خاتمہ کردیا امیر مینائی کی معلومات بڑی جامع تک کافی و وافی تھی۔ زبان اُردو کی بدقسمتی تھی کہ امیر اللغات کا پورا مواد جمع تھا مگر صرف الف ممدودہ و مقصورہ کی دو جلدیں چھپنے پائی تھیں کہ آپنے وفات پائی اور اب امیر کا ہمسر اور اُس پایہ کا محقق کوئی نظر نہیں آتا اُن کے شاگرد سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک دیوان نعتیہ اور دو دیوان عاشقانہ ایک مثنوی صبح ازل اور ایک شام ابد۔ تذکرہ انتخاب یادگار اور متعدد مُسدس وغیرہ اُن سے یادگار ہیں

نمونہ کلام یہ ہے

غزل (۱۳۸)

ضبط کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں

مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے
آج بجلی گری کہیں نہ کہیں

دل میں باتیں بھری تھیں کیا کیا کچھ
ہائے کچھ وقت و ایسیں نہ کہیں

نہ تڑپ اس قدر دلِ بیتاب
سہم جائے وہ نازنیں نہ کہیں

آگ ہو جائے گا وہ شوخ امیر
کھینچنا آہِ آتشیں نہ کہیں

(۱۳۹)

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا نشان سر مزار ہوں میں

پھر اس کی شان کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہ گار یہ کہہ دے گناہ گار ہوں میں

پڑا ہے دست اجل مجھ پہ لاکھ بار مگر
نکل گیا ہوں تڑپ کر وہ بیقرار ہوں میں

کچھ آج میں نے نئی پی ہے حضرت واعظ
از الست بپا تا بہ حشر خمار ہوں میں

نگاہ قہر سے مجھ کو نہ دیکھ اے دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گناہ گار ہوں میں

وہ کشتہ ہوں کہ مری لاش جس طرف گزرے
زمیں پکار اٹھے قابل مزار ہوں میں

وہ بے قرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکار اٹھے کہ بے قرار ہوں میں

بڑے مزے سے گزرتی ہے بیخودی میں امیر
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

(۵۵) احمدی سنہ ۱۹۰۰ء

نواب غلام احمد صاحب احمدی مرحوم یکم جنوری سنہ ۱۸۴۵ء کو بمقام کنج پورہ ضلع کرنال پیدا ہوئے۔ خاندان کنج پورہ جس کے نواب صاحب مرحوم ایک ممتاز رکن تھے پنجاب کے مشہور تاریخی خاندانوں میں سے ایک ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ نواب نجابت خاں صاحب تھے جو سنہ ۱۷۲۳ء کے قریب افغانستان سے آئے تھے۔ اور ضلع کرنال اور انبالہ میں ایک علاقہ پر حکومت حاصل کر کے کنج پورہ کو آباد کیا تھا جو اس وقت تک ریاست کنج پورہ کا صدر مقام ہے۔ نواب

غلام احمد خاں صاحب مرحوم ابتدائے عمر سے علمی مذاق رکھتے تھے اور بچپن ہی سے ان کو شعر و
شاعری اور تصنیف کا شوق تھا چنانچہ دس برس کی عمر میں اُنھوں نے ایک قصہ بنام
"قصہ کرشن" نظم میں لکھا تھا۔ عربی اور فارسی کی تکمیل کے بعد ایک مدت تک نواب صاحب
نے ملک میں سیر و سیاحت کی اور اُس کے بعد ایک عرصہ تک ریاست ٹونک میں مختلف
عہدوں پر ممتاز رہے ۱۸۷۶ء میں ریاست گوالیار میں ملازم ہوئے اور مہاراجہ جیاجی راؤ
نے ضلع عیسیٰ گڑھ کا انتظام ان کے سپرد کیا جس کا ذکر آج تک وہاں کی رعایا کے زبان زد
ہے ۱۸۸۶ء میں مہاراجہ جیاجی راؤ کی وفات پر گوالیار میں جب کونسل آف ریجنسی
قائم ہوئی اس وقت ریاست کے تمام مسلمان عہدہ داروں میں سے گورنمنٹ کی
طرف نواب صاحب کے سپرد اوّل صیغہ جوڈیشل اور ریونیو کو صیغہ تعلیم کیا جس کے
متعلق اُن کی خدمات آج تک ریاست میں مشہور ہیں اور جن کے اعتراف میں ۱۸۹۰ء میں
گورنمنٹ ہند کی طرف سے "نواب" کا خطاب مرحمت ہوا ۱۸۹۲ء میں کونسل کی مدت
ختم ہونے پر نواب صاحب فرائض منصبی سے سبکدوش ہو گئے اور آخر وقت
تک خیر کے کاموں میں مصروف رہے ۱۶ اپریل ۱۹۰۰ء مطابق ۱۳۱۸ھ کو
۶۲ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ باوجود جلیل القدر عہدوں کی ذمہ داریوں میں
مصروف رہنے کے کبھی اپنے علمی مشاغل سے دستبردار نہ ہوئے خط و خال کی
شاعری جوانی میں ہی ترک کر دی تھی۔ تہذیب اور اخلاق اور [illegible] مضامین پر
نثر و نظم میں اُن کی تصانیف موجود ہیں جن میں "مثنوی ہفت دانہ" "اثبات حق" اور

صبح نو کو خاص شہرت حاصل ہے۔

(۱۴۰)

نشاں کیا کیا دکھائے تو نے یارب بے نشاں ہوکر
عیاں کیا کچھ کیا ہے تو نے اے خالق نہاں ہوکر
تمنا ہے ترے دریوزہ گر کی تجھ کو پہچانے
ترے در تک پہونچ جائے غبار جسم و جاں ہوکر
گلستاں میں گلوں کے کان ہیں آواز پر تیری
ترا ذکر خفی کرتا ہے ہر پتا زباں ہوکر
ترا جوشش کرم رفعت اگر دے اہل پستی کو
مہ و خور زیر زمیں سایہ فگن ہو آسماں ہوکر
تمنا ہے سراپا محو ذکر ذات باری ہوں
مرا ہر موئے تن سرگرم مدحت ہو زباں ہوکر
تماشوں میں تری قدرت کے آنکھیں محو حیرت ہیں
نرالا رنگ ہے پیش نظر گلزار جہاں ہوکر
جنھیں طفلی میں صرف بازی چوگاں کو پایا
وہی محو خود آرائی نظر آئے جواں ہوکر

تن عُریاں کو ملبوسِ عنایت کی تمنا ہے
لباسِ جسم پھٹ جائے گا اک دن دھجیاں ہو کر
کہاں کا ضبط کیسا ننگ جوشش یادِ باری میں
دلِ بیتاب پہلو سے نکل بھاگا فغاں ہو کر
زباں کو میری گویا کر الٰہی اپنی مدحت میں
کروں مُردہ دلوں کو زندہ دل معجز بیاں ہو کر
ترے آثارِ قدرت پر کروں دلچسپ تقریریں
جھکاؤں گردنیں پیرانِ پیکر کی جواں ہو کر
کمر کستا ہوں تیرے نام پر تو مجھ کو ہمت دے
سہارے پر ترے اٹھتا ہوں تیرا مدح خواں ہو کر
جہاں بھُولوں بتا جس جا بہک جاؤں ہدایت کر
جو ہو لغزش تو مجھ کو تھام میرا مہرباں ہو کر
بھروسے پر تری امداد کے بیڑا اُٹھایا ہے
فلک کے بوجھ اُٹھانے پر تُلا ہوں ناتواں ہو کر

ترے در پر جبینِ احمدی سرگرم سجدہ ہے
تمنا ہے یہیں رہ جائے خاکِ آستاں ہو کر

(۵۶) مجروح سنہ ۱۹۰۲ء

میر مہدی حسین خلف میر حسین فگار دہلوی۔ میرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حالی۔ داغ۔ انور۔ ظہیر کے معصر تھے چنانچہ مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنو گے کبھی بلبل کا ترانہ ہرگز

اردوئے معلی میں ان کے نام میرزا صاحب نے بہت سے خطوط لکھے ہیں وہ موجودہ میں نازک خیال او معنی یاب شاعر تھے مگر زمانہ کی ناقدری نے انھیں دھلی سے باہر نکال دیا سنہ ۱۳۲۰ مطابق سنہ ۱۹۰۲ء میں بمقام دہلی انتقال ہوا ان کا دیوان سنہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا غالب کے رنگ میں قدیم طرز کی شاعری کرتے تھے نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۴۱) غزل

کیا زلیخا ہو خوش گلستاں میں
یہ تراکت اور اس پہ غیرت ہے
تھی وہ مجنوں کے دم ہی تک رونق
دل تو اس کا پڑا ہے زنداں میں
کیسی مضبوطیاں ہیں پیماں میں
خاک اڑتی ہے اب بیاباں میں
دلو نہ خستہ ہے نسیم بہار
کس کو معلوم جان کشتہ گلی
چپ ہوں کیوں بلبلیں گلستاں میں
محو تھے ہم تو یاد جاناں میں

وہ نگاہیں ہیں رخنہ گر اے شیخ	میرے سینے میں تیرے پیماں میں
ہاں سنبھل سیتی جنوں ہشیار	تار باقی رہے نہ داماں میں
دل خراشی ہو یا جگر سوزی	کچھ تو شغل روز ہجراں میں

درد دل کی نہیں دوا مجروح
آپ ناحق ہیں فکر درماں میں

(۵۷) زکی سنہ ۱۹۰۳ء

سید محمد زکریا خاں صاحب خلف سید محمود خاں نبیرہ نواب معظم الدولہ میر محمد خاں سرور دہلوی مؤلف تذکرہ شعرائے اردو و سادات کشمیر سے تھے ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء دہلی میں پیدا ہوئے فن شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے ان کو مرزا نے اپنی تحریر میں جو زکی کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہے اچھا شعر کہنے والا اور اپنا شاگرد رشید لکھا ہے [illegible] نوکر ہوا۔ آخر میں بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں وفات پائی اور حضرت سید احمد صاحب والد نظام الدین اولیا کی درگاہ کے باہر اس کی جنوبی دیوار کے زیر سایہ جانب مشرق دفن ہوئے۔ کلام یہ ہے:-

(۱۴۲)

بہری میں تماشا رونق کا شانہ ہو جائے	قفس ہی تیلیوں سے جل کر چراغ خانہ ہو جائے

تغافل سازیوں کا شوق اب دور کیا ہوگا
ادا سے دو فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہو جائے

نہ کہنا غیر سے قاصد کہ میں مطلب نہیں سمجھا
پیام یار ہے ہرگز نہ بیگانہ ہو جائے

نہیں کیوں حضرتِ موسیٰ کی بیتابی کے ہم پیرو
کہ رازِ دل زباں پر آئے اور افسانہ ہو جائے

خرابہ جہاں میں ہے وہ ذوقِ بادہ آشامی
کہ دورِ چرخ مجھ کو گردشِ پیمانہ ہو جائے

پھروں کیوں اس کی بزمِ ناز سے محروم جانانہ
رفیقِ شوقِ یار ہے ہمتِ مردانہ ہو جائے

کہاں تک ضبطِ بیتابیِ دلِ مسکیں مجھے چھوڑ دے
نری تجھے تحمل ہے وہ بے پروا نہ ہو جائے

تماشا عام ہوگا اور کیفِ بیخودی از بس
عجب کیا ہے قیامت صحبتِ مستانہ ہو جائے

ادائے حسن میں ہو دخل اندازِ محبت کو
دلِ صد چاک اس کے گیسوؤں کا شانہ ہو جائے

جنونِ عشق بھی ہے علم حکمت ورنہ کیا معنی
جو دیوانہ ترا ہو جائے وہ فرزانہ ہو جائے

فغاں کرتے ہوئے جا پہونچے اس کی بزمِ عشرت میں
کبھی تو اہیؔ نہ کی یہ شوخی زمانہ ہو جائے

(۱۴۳)

ہوا میں برا کی برائی تمہاری
بگڑتے ہو کیوں تم بن آئی تمہاری

مرے ایک نالے میں گھبرائے ایسے
ہوئی کیا ستم آزمائی تمہاری

نہ مجھ سے چھٹے گی نہ تم سے چھٹے گی
محبت مری بے وفائی تمہاری

ملو بھی تو وحشت میں کیونکر ملوں میں
بجا ہے یہ ناآشنائی تمہاری

مرے اضطراب و قلق کی کشش کیا
یہاں تم کو شوخی ہے لائی تمہاری

وہ زلفیں کھلیں گی کہیں حضرت دل
ہوئی سخت مشکل ۔ ہانی تمھاری

حسینوں کو چھپ چھپ کے تم دیکھتے ہو
زکی دیکھ لی پارسائی تمھاری

(۵۸) داغؔ ۱۹۰۵ء

نواب میرزا خاں دہلوی شاگرد رشید ذوق دہلوی۔ ولادت دہلی [illegible] ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء وفات حیدرآباد دکن میں بتاریخ ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۰۵ء یوم الجمعہ۔ ان کے حالات اس قدر شہرت پذیر ہیں کہ وہ تحریر سے بے نیاز ہیں انھوں نے اپنی زندگی ہی میں وہ ناموری حاصل کی کہ کسی کو کم نصیب ہوئی ہوگی تھا یہ پیرانہ سالی میں ایسا چمکا کہ عہد سلطنت مغلیہ میں کسی کسی خوش قسمت اُستاد کے ساتھ زمانہ موافقت کرتا تھا حضور نظام سادس بادشاہ دکن کی قدردانی نے ان کو چار چاند لگا دیئے۔ متاخرین دہلی میں ایسی اچھی زبان ایسی عام فہم ایسی دل پذیر غزل گوئی شاید ہی کسی کو ملی ہو گو کہ مشقی نے ان کو تبحر علمی اور زبان عربی و فارسی کی مہارت سے بے نیاز کر رکھا تھا اچھے اچھے اساتذہ معاصر کا کلام مشاعروں میں ان کے مقابل سرسبز نہ ہوتا تھا۔ یہ کچھ تو کلام کی برجستگی سادگی جذبات [illegible] کی خوبی تھی اور کچھ پڑھنے کا انداز ایسا اعلیٰ ترین تھا۔ یاد ہوگا شاید اپنے استاد کی غزل قلعہ کے مشاعرے میں ہی پڑھا کرتے تھے اس لئے کہ اُستاد کو جہاں پناہ (ظفر) کی غزل پڑھنی ہوتی تھی

ایک مثنوی "فریاد داغ" کہ یہ نام تاریخی ہے سنہ ۱۳۰۰ھ میں تصنیف کی چار دیوان شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں اور بچے بچے کی زبان پر اُن کا کلام ہے یہاں بطور نمونہ تھوڑا سا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

(۱۴۴) غزل

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

جور فلک میں خاک بھی لذت نہیں رہی
جی چاہتا ہے تیری جفائیں اُٹھائیں ہم

ڈر ہے نہ بھول جائے وہ سفاک روز حشر
دُنیا میں لکھتے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم

ناراض ہو خدا تو کریں بندگی سے خوش
معشوق روٹھ جائے تو کیونکر منائیں ہم

بے آہ کوئے یار کے چکر ہے نصیب
لیتے ہیں اپنے پاؤں کی اکثر بلائیں ہم

تاثیر کو سلام کریں دونوں ہاتھ سے
جس وقت اپنے ہاتھ دُعا کو اُٹھائیں ہم

سونپا تمھیں خدا کو چلے ہم تو نامراد
کچھ پڑھ کے بخشنا جو تمھیں یاد آئیں ہم

یہ جان تم نہ لو گے اگر آپ جائے گی
اس بے وفا کی خیر کہاں تک منائیں ہم

مانو کہا جفا نہ کرو تم وفا کے بعد
ایسا نہ ہو کہ پھیر لیں اُلٹی دُعائیں ہم

تم بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

(۱۴۵)

لذتِ سیر نہ کر چشمِ تمنا لے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

شکوۂ دہر نہ بیدادِ فلک کی فریاد
حشر میں خلقِ خدا نام تمہارا لے گی

شب چلے جان دلِ صبر خبر روزِ وصال
کیا دھرا ہے شبِ غم آ کے یہاں کیا لے گی

ایک حالت پہ ہے کب برباد ہماری مٹی
دیکھئے کب ترے دامن کا سہارا لے گی

چھین سے آپ ہیں کچھ مری پروا نہ کریں
کیا شبِ ہجر بلا ہے جو مجھے کھا لے گی

دل کا سودا تیری زلفوں نے بنا رکھا تھا
کیا خبر تھی کہ نگہ مفت میں ہتیا لے گی

کام بگڑا نہ بنائے سے بنے گا ہرگز
میری تدبیر نہ تقدیر سے بدلا لے گی

شاہِ دیندار کا وہ فیض ہے جاری اے داغ
حشر تک جس سے مزے دین کے دنیا لے گی

(۱۴۶)

اے فلک چاہیے جی بھر کے نظارا ہم کو
جا کے آنا نہیں دنیا میں دوبارا ہم کو

کبھی ایما نہ کنایہ نہ اشارا ہم کو
کم نگاہی نے تری جان سے مارا ہم کو

ہم کسی زلفِ پریشاں کی طرح اے تقدیر
خوب بگڑے تھے مگر خوب سنوارا ہم کو

جب کھنچے اُن سے ہوئے اور زیادہ مضطر — مرضِ عشق کے پرہیز نے مارا ہم کو
شکرِ صد شکر کہ اب قبر میں ہم جا پہنچے — توسنِ عمر نے منزل پہ اُتارا ہم کو
روزِ بازار کہے کون خریداروں نے — دل کی اس گرمیٔ بازار نے مارا ہم کو
چل تو اے دل رہِ اُلفت میں کہیں راہ نما — مل رہے گا کوئی اللہ کا پیارا ہم کو
ابتو ہم تنگ نہ کرو غیر یہ آفت ٹھہرے — پھر قیامت میں چھیڑیں گے دوبارہ ہم کو
باتیں اس آئنہ رو کی بھی ہیں گویا کہ طلسم — آج تو خوب ہی شیشے میں اُتارا ہم کو
آپ سے اَب نہ بنے گا کوئی سودا اپنا — پھیر دیجے دلِ بیتاب ہمارا ہم کو
ہم سمجھتے رہے ہیں سوا مردمکِ چشم سے بھی — پر جو دیکھے تو کہے آنکھ کا تارا ہم کو
باسلوکی میں مزا کیا ہی مزہ ہے اس میں — کہ ہمارا ہو تمھیں پاس تمھارا ہم کو

بحرِ ہستی میں ہوئے کشتیٔ طوفانی ہم
نہیں ملتا کہیں اے داغ کنارا ہم کو

(۱۴۷)

شباب بحرِ جہاں میں اپنا فقط مثالِ حباب دیکھا
نہ جوشش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ آب دیکھا
ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجیب عجیب انتخاب دیکھا
بُرائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین دیکھا نہ خواب دیکھا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

طرب میں جس سے ہے جان محزوں اسی کو گردش ہی ہے یہ جنوں
کہ چرخ زن مثل دور گردوں مدام جام شراب دیکھا

نظر میں ہے تیری کبریائی سما گئی تیری خود نمائی
اگرچہ دیکھی بہت خدائی مگر نہ تیرا جواب دیکھا

پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے
ہم اُس کی آنکھوں کے صدقے جس نے وہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا

جو راہ میں تیری آکے بیٹھے وہ فکر دیر و حرم سے چھوٹے
کہ تیرے کوچے کے ساکنوں نے بہشت میں بھی عذاب دیکھا

یہ دل تو اے عشق گھر ہے تیرا کہ جس کو تو نے بگاڑ ڈالا
مکاں سے تا لامکاں جو دیکھا تجھی کو خانہ خراب دیکھا

سرور عیش و نشاط کیسے بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سُنا نہ کانوں سے تھا جو ہم نے وہ آنکھوں سے انقلاب دیکھا

جو تجھ کو پایا تو کچھ نہ پایا یہ خاکداں ہم نے خاک پایا
جو تجھ کو دیکھا تو کچھ نہ دیکھا تمام عالم خراب دیکھا

شراب غفلت سے داغ عشق تھم دکھائے غفلت نے کیا تماشے
کہ سوتے سوتے چونک اُٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

(۱۷۸)

ستم ہی کرنا جفا نہ کرنا نگاہِ اُلفت کبھی نہ کرنا
تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا
ہماری میت پہ تم جو آنا تو چار آنسو بہا کے جانا
ذرا رہے پاس آبرو بھی کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا
کہاں کا آنا کہاں کا جانا وہ جانتے ہی نہیں یہ رسمیں
وہاں ہے وعدے کی بھی یہ صورت کبھی تو کرنا کبھی نہ کرنا
لیے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمھیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا
نہیں ہے آسان قتل ان کا یہ سخت جاں بھی مری بلا ہیں
قضا کو پہلے شریک کرنا یہ کام اپنی خوشی نہ کرنا
ہلاک انداز وصل کرنا کہ پردہ رہ جائے کچھ ہمارا
غمِ جدائی میں خاک کر کے کہیں عدو کی خوشی نہ کرنا
مری تو ہے بات زہر ان کو وہ اُن کے مطلب ہی کی نہ کیوں ہو
کہ اُن سے جو التجا سے کہنا غضب ہے ان کا وہی نہ کرنا

ہوا ہے گر شوق آئینہ سے تو رُخ رہے راستی کی جانب
مثالِ عارض صفائی رکھنا بہ رنگِ کاکل کجی نہ کرنا
وہ اک ہمارا طریق الفت کہ دشمنوں سے بھی مل کے چلنا
یہ ایک شیوہ ترا ستمگر کہ دوست سے دوستی نہ کرنا
ہم ایک رستہ گلی کا اُس کی دکھا کے دل کو ہوئے پشیماں
یہ حضرتِ خضر کو جتا دو کسی کی تم رہبری نہ کرنا
بیان دردِ فراق کیسا کہ ہے یہاں ابھی یہ حقیقت
جو بات کرنی تو نالہ کرنا نہیں تو وہ بھی کبھی نہ کرنا
مدار ہے ناصحو تمہیں پر تمام اب اس کی منصفی کا
ذرا تو کہنا خدا لگی بھی فقط سخن پروری نہ کرنا

بُری ہے اے داغ راہِ الفت خدا نہ لیجائے ایسے رستے
جو اپنی تم خیر چاہتے ہو تو بھول کر دل لگی نہ کرنا

(۵۹) محسن ۱۹۰۵ء

مولوی محمد محسن خلف مولوی حسن بخش علوی۔ آپ قصبہ کاکوری کے ایک شریف خاندان کے رکن تھے جو عہد ماضیہ میں علمی اعتبار سے نامور تھا اور اس کے فضل و کمال کا مقام ہندوستان

میں شہرہ نہاں ۱۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کلام جوانی میں مولوی ہادی علی صاحب اشک شاگرد
برق لکھنوی کو دکھایا۔ امیر سے اپنی نعت گوئی میں طرز خاص کے موجد ہو گئے۔ اور دہر حاضر
کے متعدد میں ایک فرد کامل تھے مین پوری میں وکالت کرتے تھے۔ ۲۰ صفر ۱۳۲۳ھ
مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء میں وہیں آپ کا انتقال ہو گیا۔ زبان کی صفائی کے ساتھ
کلام سوز و گداز اور جذبات سے پر ہوتا ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

(۱۴۹) عشق و محبت کی بے چینی کا نقشہ

ایک نظر مہر کی مجھ پر ساقی
مہرباں تشنہ لبوں پر ہو جا
کشتئ مے چلے میرے بغیر
کرتے ہے صرف تماشہ جیتا بھر کے
گردش جام شرابی ساقی
غرق کرتا ہے تلاطم مجھ کو
یہ بھی اک فتنہ ہے شب ساقی
چھینٹے دے دے کے ڈرلاتا ہے مجھے
ہیں کیا رنگ دکھاتے محسن

تا ہر و آئینہ پیکر ساقی
دل کی لہروں کا سمندر ہو جا
میرے دریا تیرے ساغر کی دیر
نے صراحی نہ صراحی بھر کے
ترم آئے ترم آئے سکانی
آج للہ کوئی آتش مجھ کو
یار کہتا ہے مخاطب ساقی
غیر بن بن کے بناتا ہے مجھے
ستم کیوں ہو سے پیالے محسن

نہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری
اُڑ گیا رنگ ترا بو ہو کر
حیف حالت تری دُکھ پائی ہوئی
لب پہ آئے ہوئے نالے پیہم
چہرہ ڈوبا ہوا حیرانی میں
زردی چھائی ہوئی رخسار پہ ہے
مُردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو
چھپ گیا چاند ستارہ ہو کر
ہر دم اک رنگ بدلتا ہے کیوں
یہ اثر کچھ ترے گلکاری کے
کامدانی کا پہننا چھوڑا
رنگ اُڑ اُڑ کے بکھر جانے لگا
بند آنکھیں کئی رنگ دیکھا
کس بلا کا تو ہوا ہے مجنوں
کوہ پر جا کے اگر سر مارے
باتیں کرتے ہو تو رک جاتے ہو
کبھی ہنستے ہو تو رنگ گلنے سے

ارے کیا ہو گئی حالت تیری
بہہ گیا خونِ دل آنسو ہو کر
ہائے صورت تری مرجھائی ہوئی
ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پرنم
عرق آیا ہوا پیشانی پر
سر سُوں پھولی ہوئی انگاروں میں
اپنی جانی ہوئی دُنیا دیکھو
اُڑ گیا آئینہ پارہ ہو کر
شمع کی طرح سے جلتا ہے کیوں
جن کی کلیوں میں چھپے ہیں کانٹے
لٹ گیا تیرا سہانا جوڑا
ناتوانی کو بھی غش آنے لگا
رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا
لیلے الکتنی ملا تیرا لیلیوں
کو کسی نے بھی تجھے پتھر مارے
آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو
کبھی ہنستے ہو تو دیوانے سے

شہر کا سیر تماشا چھوڑا ‌ ‌ چاندنی چوک کا رستہ چھوڑا
رکھدیئے موسم گل میں کیونکر ‌ ‌ طاق نسیاں پہ شہر کے ساغر
آشنا گل کے نہ سوسن کے رہے ‌ ‌ باغ میں تم تو خزاں بن کے رہے
بیٹھے جنگل میں نہ یکسو ہوکر ‌ ‌ کالے کوسوں پھرے آہو ہوکر
نجد میں تیر اگلا ہوتا ہے ‌ ‌ قیس لیلے پہ خفا ہوتا ہے
کسی بت نے تجھے حیران کیا ‌ ‌ کسی کافر نے مسلمان کیا
بیٹھے بٹھلائے یہ سودا تجھ کو ‌ ‌ کیا ہوا میرے کنہیا تجھ کو
دیکھ بھر آئیں تری بھر آنکھیں ‌ ‌ یاد آئیں تجھے کافر آنکھیں
خون میں ڈوبی نگاہیں کیسی ‌ ‌ ہیں مری جان یہ آہیں کیسی
بگڑی کیوں ہے ترے بسمل چتون ‌ ‌ یاد آئی کوئی قاتل چتون
عشق گیسو نے یہ عقدہ کھولا ‌ ‌ سر پہ چڑھ کر ترے جادو بولا
جال پھیلائے ہیں منتر والے ‌ ‌ بال کھولے ہوئے گھونگر والے
جان لیتے ہیں نکھرنے والے ‌ ‌ تم سلامت رہو مرنے والے
دل لگا ہے تو پشیمانی کیوں ‌ ‌ جان کی فکر مرے جانی کیوں
آبرو کی تجھے پروا کب تک ‌ ‌ ننگ و ناموس کا کھٹکا کب تک
ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو ‌ ‌ تم تو پئے ہوئے متوالے ہو
نشہ کہیں ایک زمانی آخر ‌ ‌ مٹ گئی تیری جوانی آخر

چاندنی پچھلے پہر کی کب تک — روشنی شمع سحر کی کب تک
دل ناشاد کو رکھے قابو میں — نہ سہی یار نہ ہو پہلو میں
بس اب مجھے آتے ہیں چکر ساقی — لے مرے ہاتھ سے ساغر ساقی
ہاتھ لینا ہے مجھے غش آتا ہے — دل کہیں اور لیے جاتا ہے
تیری محفل کا یہی طور رہا ہے — دور جب تک رہے یہ دور رہا ہے

(۱۲۰) ارشد سنہ ۱۹۰۶ء

ارشد صاحب عالم میرزا عبدالغنی گورگانی دہلوی خلف میرزا اعلیٰ بہادر سلسلۂ نسب حضرت احمد شاہ بادشاہ تک پہونچتا ہے۔ آپ کی پیدائش قلعہ دہلی میں ہوئی تھی۔ چھ سات برس کی عمر تھی شاہزادہ میرزا نادر بخش صاحب سے علم عروض حاصل کیا اور فن سخن میں ان کے شاگرد ہوگئے۔ شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں کامل استعداد تھی۔ مرثیہ سلام پڑھنے کا شوق تھا۔ تاریخ گوئی میں کامل تھے طرز قدیم کے علاوہ جدید طرز میں بھی نظم لکھتے تھے۔ سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم تھے ان کی عمر کا زیادہ حصہ فیروزپور میں گزرا تھا ۱۲ فروری سنہ ۱۹۰۶ء مطابق سنہ ۱۳۲۳ھ کو ملتان میں انتقال کیا کوئی دیوان نہیں چھپا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۵۰) غزل

الٰہی جان دی ہے کس نے کس کے روئے روشن پر
ہزاروں شمعیں پروانہ بنی ہیں میرے مدفن پر

اُگا ہے پنجۂ مرجاں جو اپنی خاک مدفن پر
تو وقفِ فاتحہ ہے بدگماں کا ہاتھ دامن پر

تعجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی
چڑھا ہے خون کس کس بے گنہ کا اس کی گردن پر

وہ بے انصاف اور اپنی وفا کی داد یاقسمت
گمانِ دوستی ہے سادگی سے ہم کو دشمن پر

نہیں کھلتا نہیں کھلتا کہ مجھ سے کیا رکاوٹ ہے
کہ کچھ رک رک کے چلتی ہے تری تلوار گردن پر

عجب اس جلوۂ یکتا میں نیرنگِ تماشا ہے
نئی صورت سے چمکا خاطرِ شیخ و برہمن پر

میں ہوں مرہونِ منتِ صلح کل کا جب سے اے ارشد
یقینِ دوستی ہونے لگا ہے مجھ کو دشمن پر

(۶۱) راسخ ۱۹۰۷ء

مولوی حافظ عبدالرحمٰن راسخ دہلوی خلف دوم مولوی محمد حسنین فقیر ان کے دادا مولوی محمد اسمٰعیل مدار المہام ریاست پانودی کا اصلی وطن سامانہ علاقہ ریاست پٹیالہ تھا کچھ عرصہ تک بستی قصبہ مظفر نگر میں سکونت اختیار کی اسکے بعد دہلی آ گئے۔ مولانا راسخ کے والد خاقانی ہند استاد ذوق کے شاگرد تھے انھیں سے استفادہ سخن کیا مولانا راسخ نے نویں سال کلام مجید حفظ کر کے مسجد میں محراب سنادی تھی۔ نثر نگاری اور شعر و شاعری کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ اسی سلسلہ میں بے مثال پنچ جاری کیا خیر خواہ عالم چلنا پرزہ، فضل الاخبار اور دہلی پنچ کی ایڈیٹری کی۔ مگر چونکہ ان کے والد دوران طالب علمی میں ان اشغال سے ناخوش تھے اس لئے حصول تعلیم میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ فضیلت کی سند حاصل کی اور وعظ گوئی میں کمال حاصل کیا۔ اسی زمانے میں مثنوی مولانا روم کی نظم کی شرح لکھی جس کے دو دفتر شائع بھی ہو گئے۔ آخر میں اردو شاعری ترک کر دی تھی جبھی کبھی فارسی میں کچھ لکھ لیتے تھے ۲۹ ستمبر ۱۹۰۷ء مطابق ۱۳۲۵ھ بعمر ۴۴ سال انتقال کیا اور مہندیوں کے قبرستان میں حریم محمد ثمین کے ۶ در شرقی دیوار کے زیر پایہ دفن ہوئے مرات الخیال اور کمال راسخ دو مطبوعہ دیوان سے یادگار ہیں اولاد نہیں چھوڑی

(۱۵۱) غزل

کہاں تھے شب ادھر دیکھو حیا کیوں ہو نگاہوں میں

اگر منظور ہی رکھو تو مجھے جھوٹے گواہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشکِ گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یارب گناہوں میں

موحد وہ ہوں گر میں سرِ وحدت کان میں کہہ دوں
تو دن بت کدہ میں ہوں برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چرا کر منہ چھپا کر کہئے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

تعجب کیا ہے نکلے کوئی دن میں مانگ بھی ٹیڑھی
غضب کا بانکپن دیکھا ہے ہم نے کج کلاہوں میں

نہ میں عرشِ بریں پر ہوں نہ میں فرشِ زمیں پر ہوں
مری ہستی ہے گویا نیستی میری نگاہوں میں

لبوں کے بوسے دے دے کر عدو کو کیوں مکرتے ہو
زباں شامل نہ ہو جائے کہیں جھوٹے گواہوں میں

عدو دل جل کے گر مجھ سے کریں نالے تو اچھا ہے
ملے دادِ ستم اپنا اگر ہو دادخواہوں میں

حجابِ دیدۂ خود بیں حجابِ ظاہرِ بد بیں
پڑے رہنے ہیں یہ پردے تمہاری جلوہ گاہوں میں

ہماری طرح تم پر بوالہوس مرکیوں نہیں جاتے
اگر ہیں جاں نثاروں میں اگر ہیں داد خواہوں میں
دبا کر رکھ لیا ہے چال میں محشر کے فتنوں کو
جگا کر رکھ لیا ہے شوخ نے جادو نگاہوں میں
جگر بھی خوش ہو دل بھی خوش کہیں یہ بھی کہیں نکلیں
غضب کی میٹھی چھریاں ہیں تری نیچی نگاہوں میں
وہی راسخ تو ہیں کل تک جو مے خانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

(۶۲) شہباز ۱۹۰۸ء

پھلواری سید محمد عبد الغفور خلف سید طالب علی ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے ابتدا سے مضمون نگاری کا شوق تھا اخبار دارالسلطنت و اردو گائڈ کلکتہ کے ایڈیٹر رہے تھے اس کے بعد ریاست حیدر آباد میں تعلق ہو گیا، یہاں اورنگ آباد کالج میں پروفیسری کے عہدے پر ممتاز رہے بھوپال میں سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی برجستہ شعر کہتے تھے آپ اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ممتاز نامہ نگاروں میں تھے آپ کی نظم کا مجموعہ حیات شہباز کے نام سے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں چھپا ہے ان کی نظموں میں فلسفہ انسانی کی باریکیاں اور قدرت کے نکات صاف اور ستھری زبان میں

نظر آتے ہیں۔ ۲۰ نومبر ۱۹۰۸ء مطابق ۱۳۲۶ھ کو وفات پائی۔ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

(۱۵۲) سمندر

بڑی ہی اک عظیم الشان شے ہے
پڑے جس میں کروڑوں بن طے ستے

ہزاروں جس میں مخفی گنج شاہی
کروڑوں جس میں اسرار الٰہی

زیادہ جس کی گہرائی خرد سے
عیاں جس کی اونچائی تند و مد سے

خیالوں سے بڑا پھیلاؤ جس کا
سمیٹے خوبیاں سمٹاؤ جس کا

فلک جس کے قدم لینے کو جھک جائے
زمانہ جس پہ دم لینے کو رک جائے

ستارے جس پہ شیدا ماہ مفتوں
بلا گرداں ہو جس کا مہر گردوں

گھٹا جھکی ہوئی جس کی بدولت
شفق پھولی ہوئی جس کی بدولت

پہاڑوں کو جہاں روڑوں کا رتبہ
جہاں گوہروں سے کم گھونگوں کا رتبہ

جہاں طوفانِ نوح اک موج نوخیز
جہاں خود چشمِ قدرت حیرت آمیز

(۱۵۳) صبح پیری

کیا جانئے سر کے بال تھے مدت سے کیوں سپید
زلف جنوں کا وہ رنگ پہ اب یہ غضب ہوا

سیمیں یہ موئے سر ہیں طنابیں ہیں نور کی
خیمہ سحر کا آن گڑا کوچ شب ہوا

اب کیجے رہا لے معرکۂ زندگی کے کام
ہونا تھا جتنا بزم میں عیش و طرب ہوا

کیا دیکھے آئینہ کوئی ہم منہ ہی نہیں ہے جب
بیکار ہی جو قبضے میں شہر حلب ہوا

آنکھوں کی دوربینوں میں بھی اب نہیں وہ زور
دانتوں کا بھی حصار مرمت طلب ہوا

جاسوس کان کے ٹپ سے ہوتے ہیں بے خبر
انکی بلا سے دہر میں شور و شغب ہوا

طاقت کہاں بیان میں کہ دیجے گلوں کو طول
مجبوریوں سے وردِ زباں شکر رب ہوا

وہ دن کہاں کہ صبح سے ہو سیر چوک کی
بازار عیش گرم جہاں رفتِ شب ہوا

پاؤں کے راہوار اٹھاتے نہیں قدم
کمری جو یک بیک تھے ہٹے۔ کیا سبب ہوا

امعا جو بگڑے پھر نہ ہوئے ایک مستقیم
معدے میں گرچہ ہضم مسلم مطلب ہوا

شہباز کو کہ غرض سے تھا دور جو بزرگ سا
کیونکر خیال نافلۂ مستحب ہوا

جب تک رہا وہ ہند میں تھا شیخ فاسفان
کعبے گیا تو قبلۂ شیخ العرب ہوا

(۶۳) راقم ۱۹۰۹ء

خواجہ قمرالدین دہلوی بدرالدین مترجم بوستان خیال کے بیٹے تھے میرزا غالب مرحوم کے شاگرد ریاست جے پور کے وظیفہ خوار تھے آخر عمر میں دہلی چھوڑ کر وہیں چلے گئے تھے اُن کا دیوان ۱۸۹۶ء میں افضل المطابع دہلی میں طبع ہو چکا ہے ۱۹۰۵ء کے قریب انتقال ہوا۔ ان کی ایک کتاب تعلیم نسواں میں "عقد ثریا" کے نام سے یادگار ہے۔

(۱۵۴) غزل

بات کیونکر بنے اُمید بر آئے کیونکر
نالۂ پُر شور نہیں آہ شرر بار نہیں

آج آئے ہیں مرے شکووں کا لینے وہ حساب
خیر ہے ہاتھ میں ان کے کوئی تلوار نہیں

مجھ سے نفرت ہی سہی لذّت کشِ آزار تو ہوں
غیر پھر غیر ہے وہ خوگرِ آزار نہیں

جوشِ مستی میں یہاں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو خانۂ خمار نہیں

(۹۴) جلیب سنہ ۱۹۰۹ء

محمد کاظم آپ کا سلسلہ نسب سید حمزہ ابن موسیٰ کاظم علیہ السلام تک پہونچتا ہے اور قصبہ گنتور علاقہ اودھ کے رہنے والے گیارہ برس کی عمر سے شعر و سخن کا شوق ہوا سب سے پہلے اپنا کلام سید لطف اللہ قدر شاگرد ناسخ کو دکھایا پھر سید حسین مرزا عاشق لکھنوی سے استفادۂ سخن حاصل کیا جو ناسخ کے قابل شاگرد تھے آپ ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے ۱۹۰۹ء میں وفات پائی۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

(۱۵۵) غزل

حُسن جب صورت گرِ ذوقِ خود آرائی ہوا
ہر محبت بے باک گرمِ لافِ یکتائی ہوا
عشق نے سارے زمانے کو بنایا بدگماں
خود بخود میرا نظر پڑنا وجہِ رسوائی ہوا

اِک جہاں شیدا ہے صورت آشنا کوئی نہیں
سب کو اپنا کر لیا کس کا وہ ہرجائی ہوا

کچھ بجز غفلت نہ ہاتھ آیا متاعِ دہر سے
مالِ دُنیا صرف شغلِ بادہ پیمائی ہوا

دستِ قدرت نے دکھائیں ایسی شکلیں کھینچکر
کوئی ازخود رفتہ اور کوئی تماشائی ہوا

کون ہوسکتا تھا دنیا میں کسی کا روشناس
چھپ کے ہر پردہ میں تو وجہ شناسائی ہوا

اے مسبب دور کردے رنج و حرمانِ حبیب
وہ بھی کوئی شے ہے جس کا یہ تمنائی ہوا

(۶۵) جلال سنہ ۱۹۰۹ء

سید ضامن علی خلف حکیم اصغر علی لکھنوی مرزا آبرق و رشک شاگردانِ ناسخ کی کی تلامذہ میں تھے تحقیق میں اچھی دستگاہ تھی ان کی تصانیف ان کی قابلیت کی شاہد ہیں تنقیح اللغات افادۂ تاریخ، رسالۂ عروض سرمایہ زبان اُردو (لغت) اور تین دیوان اُن سے یادگار ہیں اُنھوں نے اپنی وفات پر لکھنؤ میں اپنا ہمسر کوئی نہ چھوڑا ۱۳۲۷ھ

مطابق ۱۹۰۹ء انتقال ہوا بہت سے شاگرد چھوڑے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۵۶)

جذبِ دل کھینچ اسے دست و گریباں ہوکر
دے جگہ یار کو پہلو میں رگِ جاں ہوکر
خوش نگاہوں کے کرشمے کوئی ہم سے پوچھے
آنکھ میں کرتے ہیں گھر آنکھ میں پنہاں ہوکر
دستِ وحشت سے کہوں گا کہ اسے بھی کرچاک
دل مجھے تنگ کرے گا جو گریباں ہوکر
حسرتِ ناوکِ قاتل میں جو دل بھر آیا
آنسو آنکھوں میں کھٹکنے لگے پیکاں ہوکر
نزع میں اس لئے کھولے ہوئے بال آئے ہیں وہ
روح عاشق کی جو نکلے تو پریشاں ہوکر
ہائے اُس شوخ کی شرمندگیٔ جور وستم
مار ڈالا ہمیں ظالم نے پشیماں ہوکر
محفلِ یار سے کیوں کر نہ نکالے جاتے
ہم گئے تھے ہمہ تن حسرت و ارماں ہوکر

سب بے وفائی ہیں نہ تھا یار سے کم عہدِ شباب
چلدیا صبح کو اک رات کا مہماں ہوکر

نہ رہے ہم سے سیہ بخت کو کیا غم ہو جلال
دیکھئے رہتی ہے کس کی شب ہجراں ہوکر

(۱۵۷)

اُس سے کچھ ذکر مرا بھی دلِ ناشاد رہے
وقت پر بھول نہ جانا یہ تجھے یاد رہے

کسی بے درد کو میں حال سنا لوں اپنا
نالہ خاموش رہے چپ بھی فریاد رہے

یار کی ایک جفا کے مرے دل میں سو داغ
سو وفائیں مری اور اک نہ اُسے یاد رہے

نامرادوں کی ہوئیں آج مرادیں پوری
ہم کو ناشاد لقب اس نے دیا شاد رہے

روح جنت میں دل ہم میں ہم مدفن میں
تیرے آوارہ پس مرگ بھی برباد رہے

اب کسی سے یہ کہیں کس کے کہ ہمیں رنج ہی دے
شاد ہونے کی تمنا ہیں تو ناشاد رہے

خیر بھولے نہیں وہ تیری وفاؤں کو جلال
یہ غنیمت ہے کہ جور اپنے انھیں یاد رہے

(۶۶) آزاد سنہ ۱۹۱۰ء

پروفیسر مولوی محمد حسین آزاد شمس العلماء ان کے والد کا نام محمد باقر تھا جو شرفاء دہلی

میں ایک مشہور شخص تھے اُنھوں نے ۱۸۳۶ء میں اُردو زبان کا سب سے پہلا اخبار دہلی سے شائع کیا تھا وہ شاعر بھی تھے اور اُستاد ذوق سے تلمذ رکھتے تھے لیکن ان کا کلام مشہور نہیں ہوا نہ دیوان چھپا اُن کو اُردو نثر میں اپنے خاص رنگ کے سبب بہت کچھ شہرت حاصل ہوئی. شاہراہ قدیم سے ہٹ کر اردو شاعری میں ایک جدید روش پیدا کرنے کا خیال سب سے پہلے انھیں کو آیا تھا۔ آزاد کی طرز تحریر نظم و نثر دونوں کسی تعریف کی محتاج نہیں بیان کی لطافت زبان کی سلاست بندش کی چستی اور محاورے کی دل آویزی سب کچھ ان کے یہاں موجود ہے ان کی کثیر تصنیفات ہیں دربار اکبری نیرنگ خیال سخندان پارس آب حیات مشہور اور مقبول ہیں۔ ان کا کچھ کلام مجموعہ نظم آزاد کے نام سے چھپ گیا ہے ۱۸۸۹ء میں ایک دماغی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن اس وقت بھی عالمانہ خیالات ہی دماغ میں چکر لگاتے تھے جس کی جھلک "سپاک نماک" میں پائی جاتی ہے جو اسی زمانہ جنون کی تصنیف ہے ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ میں بمقام لاہور انتقال ہوا۔

کلام کا انتخاب یہ ہے:

(۱۵۸) خسروِ امن کا دربارِ علم

دفعتاً دیکھا کہ اک پیر کہن سال آئے ۔۔۔ پر عجب شان سے وہ مرد خوش اعمال آئے
جسمِ پُرنور میں پہنے ہوئے جامہ کالا ۔۔۔ بر میں جبّہ عربی سر پہ عمامہ کالا
پاؤں تک شملۂ دستار جو آجاتا تھا ۔۔۔ ان کی مقدار فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغری چہرہ پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت
رخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریشِ مقدس میں کیا پیری نے
اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں بھی اٹھائے آئے
اور بغل میں کئی جزدان دبائے آئے

سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے
ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

الغرض بادشہِ امن کے آگے آئے
پہلے سب نے باادب دستِ دعا پھیلائے

پھر یہ کی عرض کہ آتے ہیں وکالت کیلئے
علم نے بھیجا ہے تقدیمِ رسالت کے لئے

اہلِ تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا
ہے ہر اک شہرت و تعریف میں مصروف سدا

اہلِ تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں
اور جہاں میں انھیں فکرِ سحر و شام نہیں

دم بدم علم سے کرتا عمل ایجاد نئے
آتے ہیں کارگہِ دہر میں استاد نئے

درس و تدریس کے چرچے ہیں گھر گھر جاری
ہیں یہ جمعیتِ خاطر ہی کی باتیں ساری

جو ہمیں چاہئیں موجود ہیں سارے ساماں
ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں

اے شہِ امن یہ سب فیض و کرم تیرے ہیں
کشورِ علم میں سب جلوے بہ دم تیرے ہیں

تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفان مچ جائے
سب کا شیرازۂ ادراک پریشاں ہو جائے

(۱۵۹) زمستاں

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو بہتے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے

دامانِ کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دبکا لحاف برف میں منہ کو لپیٹ کر

دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سفید
باہر چلو تو دامن کوہسار تھے سفید
سنسان جنگل اور درختوں کی سائیں سائیں
چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتی بلائیں
طوفان برف سر پہ کھڑا ہے تلا ہوا
ہے یہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا
موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے بہک گئی
خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آ رہیں
جو زیر و بم کے دور سے ہیں سُر ملا رہیں

(۱۶۰) صبح کا سماں

ناگہ فلک پہ دامنِ شب چاک ہوگیا
لبریز نور سے طبقِ خاک ہوگیا
منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا
گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نورِ ظہور کی
چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گلِ تر کی لالیاں
اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا
اور جھوم جھوم کر وہ رخِ گل کا چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی
شبنم تھی آکے رات کو موتی گرا گئی

پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے
پالے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے

(۶۷) سرورؔ ۱۹۱۰ء

منشی درگا سہائے ولد حکیم پیارے لال قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے باشندے تھے وہیں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے زمانہ طالب علمی سے اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کا شوق تھا فطرت نے شاعری کا جو مادہ طبیعت میں ودیعت کیا تھا اس مطالعہ سے وہ ابھر آیا اور خود بھی شعر کہنے لگے زیادہ تر نیچرل نظمیں کہی تھیں جن کو ہندوستان کے اخبار اور رسالے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے ۱۹۱۱ء میں ان کی نظموں کا مجموعہ "زمانہ پریس" کانپور میں چھپا ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ کو ۳۷ سال کی عمر میں جوان فوت ہو گئے۔

کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

(۱۶۱) دل بے قرار سو جا

کسی مست خواب کا ہی عبث انتظار سو جا
کہ گزر گئی شب آدھی دل بے قرار سو جا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری دل بے قرار سو جا

یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کردے
مرے پردہ دار سوجا مرے راز دار سوجا

مجھے خوں رُلا رہا ہے ترا دم بدم تڑپنا
ترے غم میں آہ کب سے ہوں میں اشکبار سوجا

ابھی دھان پان سا ہے تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سوجا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھالوں
تجھے سینہ سے لگالوں تجھے کرلوں پیار سوجا

تجھے جن کا ہے تصوّر ارے مستِ جامِ الفت
انہیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سوجا

تجھے پہلا سابقہ ہے شبِ غم بُری بلا ہے
کہیں مرمٹے نہ ظالم دلِ بے قرار سوجا

(۶۸) ظہیر ۱۹۱۱ء

نواب مرزا سیّد ظہیر الدین حسین دہلوی خلف اکبر سید جلال الدین حیدر صلاح الدولہ مرصع رقم خاں اُستاد بہادر شاہ ظفر مرحوم خاقانی ہند ذوقؔ کے نامور شاگرد تھے دربار شاہی

سے چودہ (۱۴) سال کی عمر میں "راقم الدولہ" کا خطاب مع قلمدان شاہی عطا ہوا تھا۔ دو مرحوم کے اساتذہ بہر میں سر برآوردہ تھے غزل کشیدہ۔ رُباعی۔ مسدس۔ مخمس۔ مثنوی غرض جملہ اصناف سخن پر قدرت تام رکھتے تھے۔ غدر کے بعد ریاست جے پور میں چلے گئے تھے وہاں کچھ دنوں رہے اس کے بعد ریاست ٹونک میں ملازم ہو گئے غفران مآب ہز ہائی نس میر محبوب علی خاں والی دکن کی قدر افزائی کا شہرہ سنکر ریاست حیدرآباد میں تشریف لائے دربار تک رسائی نہ ہونے پائی تھی کہ علیل ہو گئے اور مارچ سنہ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۹ھ میں انتقال فرمایا تین دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ کلام یہ ہے:۔

غزل (۱۶۲)

گل افشانی کے دم بھرتی ہے چشم خوں فشاں کیا کیا
ہمارے زیب دامن ہے بہار گلستاں کیا کیا

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
نگاہ شرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا

دل خوں گشتۂ حسرت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
بہار آ گئیں ہے کچھ ایسے برس فصل خزاں کیا کیا

جنوں سے کم نہیں ہے کچھ ہجوم شادمانی بھی
ہوائے گل میں ہے جامہ سے باہر باغباں کیا کیا

تصور میں وصال یار کے ساماں ہوتے ہیں
تیری بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا

چلی آتی ہے اترائی ہوئی کچھ کوئے جاناں سے
بسی ہے رشک کی بو میں نسیم بوستاں کیا کیا

قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے
بڑھا جاتا ہے یاں شوقِ سجود آستاں کیا کیا

ظہیر خستہ جاں سچ ہے محبت کچھ بری شے ہے
مجازی میں حقیقی کے ہوئے ہیں امتحاں کیا کیا

(۱۶۳)

یہ رنگ الفت اگر نہ ہوتا تو کچھ خدائی میں کم نہ ہوتا
کسی پہ کوئی نہ جان دیتا کسی پہ جور و ستم نہ ہوتا

عدو جو شایانِ ظلم ہوتے تو لطف درد و الم نہ ہوتا
مزے محبت کے کون لیتا جو میں قتیل ستم نہ ہوتا

اگر نہ کرتے وہ کج ادائی تو کچھ عداوت سے کم نہ ہوتا
جو یہ نہ ہوتی تو کیا نہ ہوتا جفا نہ ہوتی ستم نہ ہوتا

غلط ہی شکوہ کہ وہ نہ آئے مجھے تو ہر طرح موت آئی
اگر وہ آتے تو جی نہ جاتا کہ فرطِ شادی سے دم نہ ہوتا

یہ ہئے اپنا ہی جی نہ چاہا وگرنہ خوفِ رقیب کیا تھا
کہ آپ آتے تو اُڑ کے آتے زمیں پہ نقشِ قدم نہ ہوتا

غضب ہی شورشِ تپشِ قیامت سوا ہے دوزخ سے سوزِ اُلفت
وگرنہ جانِ حزیں پہ اتنا کبھی عذابِ الم نہ ہوتا

اگر عدو پہ عذاب ہوتا نہ دل میں یوں پیچ و تاب ہوتا
جبیں پہ ہر دم شکن نہ پڑتی شکن سے ابرو میں خم نہ ہوتا

ظہیر ملتی نہ راہِ ایماں جو کفر کرتا نہ رہنمائی
لبوں پہ یادِ خدا نہ ہوتی جو دردِ ہجرِ صنم نہ ہوتا

(۷۹) آصف سنہ ۱۹۱۱ء

ہزہائی نس میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سادس۔ آپ ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے اور ۲۹ فروری سنہ ۱۸۶۸ء میں کچھ کم تین برس کی عمر میں باقاعدہ تخت نشین ہوئے، انگریزی، عربی، فارسی سے بخوبی واقف تھے اور لڑکپن سے علمی مذاق میں فرد و یگانہ تھے جسکا کہ نہایت شوق تھا شعر و سخن سے آپ کی

طبیعت کو خاص مناسبت تھی حضرت داغ دہلوی مرحوم اس فن میں مشورہ دیتے تھے شعر میں سلاست زبان و مضمون آفرینی کا لحاظ رکھتے تھے۔ تاریخ وفات ۲۹ راگست ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ ہی۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ کلام یہ ہی:-

غزل (۱۶۴)

یہ دل آشنا اور نا آشنا ہی　　بھلوں سے بھلا اور بُروں سے بُرا ہی
نہیں ہی اگر تو ہمارا تو کیا ہے　　زمانہ میں کوئی کسی کا ہوا ہی
پیو بھی پلاؤ بھی اس کا مزہ ہی　　یہ شیشہ بھرا ہی یہ ساغر دھرا ہی
مزہ ہی یہی بات میں بات نکلے　　ادا سے ادا جب نہ ہو پھر تو کیا ہی
نشانہ بنے دیکھیے کونسا دل　　یہ تیر دُعا ہی وہ تیر ادا ہی
کریں بت کدہ سے عبث قصدِ کعبہ　　یہاں بھی خدا ہی وہاں بھی خدا ہی
کہاں جائے انسان ان سے نکل کر　　زمیں فتنہ گر ہی فلک فتنہ زا ہی
شبِ وصل کس طرح طے ہو یہ جھگڑا　　نہ تم مانتے ہو نہ دل مانتا ہی
کہو پھر تو گھبرا کے ذکرِ عدو پر　　نہیں ہم تو واقف خدا جانتا ہی
یہ کافر حسیں اک جگہ جمع ہوں گے　　جہنم میں بھی اک طرح کا مزا ہی
بہت دور ہی منزلِ دوست اے دل　　جو یہ طے ہوئی پھر خدا ہی خدا ہی
کوئی بے وفاؤں کے دم میں نہ آئے　　محبت جو کی تھی یہ اس کی سزا ہی

ہمارے بھی ہی امتحاں میں یہ آصف لگانا ہی دل کا سراسر غلط ہی	

(۷۰) تسلیم سنہ ۱۹۱۱ء

شیخ امیر اللہ خلف مولوی عبد الصمد صاحب فیض آبادی شاگرد رشید میرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی آپ ۱۸۲۳ء میں جبکہ غازی الدین حیدر مسند نشین ہوئے تھے پیدا ہوئے عرصہ دراز تک لکھنؤ میں رہے وہاں کے مشاعروں میں شرکت کی اہل سخن سے صحبت گرم رہی اس کے بعد نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد میں رام پور تشریف لائے اور مشاہیر شعرا میں اپنی بلند خیالی اور سخن سرائی کی داد پائی آپ کے دو دیوان اور مثنویات نالۂ تسلیم دل وجان ۔ صبح خنداں طبع ہو چکی ہیں دور موجودہ کے شعرا میں نامور تھے ۔ سلسلہ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ میں انتقال کیا ۔

(۱۶۵) غزل

قیامت کی ہی بے تابی سرشک چشم گریاں میں
۱ کبھی پہلوئے مژگاں میں کبھی آغوش داماں میں
دم طفلی سے میں ہوں آشنائے مرگ دوراں میں
فلک نے مجھ کو پالا دامن شمشیر عریاں میں

بنی ہی یہ میرے دم پر کہ میں چھپلے پہر آخر
اجل کو ڈھونڈھنے نکلا شب تاریک ہجراں میں

نظر کر اے ستم گر ربطِ باہم اس کو کہتے ہیں
کہ پیکاں دل میں ہی دل نازبرداریِ پیکاں میں

ہوا ہیں زندۂ جاوید ہو کر قتل اے قاتل
بجھی بخشی کیا تری شمشیر موجِ آبِ حیواں میں

جھکا دو شرم سے عالم دکھا کر قدِ موزوں کا
اُٹھایا ہی بہت سروِ سہی نے سر گلستاں میں

چلو گھر خاک بھی ڈالو حِنا کا خون ہوتا ہے
کفِ افسوس ملتے ہو کھڑے گنجِ شہیداں میں

حسینوں سے بگڑنا اور دل کو داغ دیتا ہی
بہت روئی زلیخا بھیجکر یوسف کو زنداں میں

ڈراتا کیوں ہی اے تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
مرا حصہ نہیں ہی کیا خدا کے فضل و احساں میں

(۷۱) بیخودؔ سنہ ۱۹۱۲ء

بیخود۔ مولوی عبدالحی۔ تخلص بیخودؔ۔ خلف مولوی غلام سرور صدیقی بدایونی ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۷ ستمبر ۱۸۵۶ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ فارسی عربی سے بخوبی ماہر تھے دونوں زبانوں میں عمدہ استعداد رکھتے تھے۔ خوش رو۔ خوش لباس۔ زندہ دل۔ رنگین مزاج شاعر تھے۔ اساتذہ گزشتہ کے ذوق سخن سے آشنا ہوکر خود بھی معنی آفرینی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ سب سے پہلے حضرت حالیؔ مرحوم کے شاگرد ہوئے آخر میں جناب داغؔ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ان کا کلام صفائی بیان اور جذبات سے مالامال ہے پہلے شاہجہانپور میں وکالت کی آخر عمر میں ریاست جودھپور میں مجسٹریٹ تھے۔ نومبر ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۰ھ میں انتقال ہوا۔ بدایوں میں حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے بیرونی چبوترہ پر دفن ہیں۔

کلام یہ ہے

(۹۹) غزل

درد دل میں کمی نہ ہو جائے	دوستی تم دشمنی نہ ہو جائے
کیسے ہو کوئی ہم کو دل کیوں دے	کہیں سچ مچ یہی نہ ہو جائے
تم مری دوستی کا دم نہ بھرو	آسماں مدعی نہ ہو جائے

کج ادائی تری ادا ٹھہری | میری نیکی بدی نہ ہوجائے
بیٹھتا ہوں ہمیشہ رندوں میں | کہیں زاہد ولی نہ ہوجائے
طالع بد وہاں کبھی ساتھ نہ دے | موت بھی زندگی نہ ہوجائے
حشر پر دید کیوں اُٹھا رکھی | ہونے والی ابھی نہ ہوجائے
بھُول جائیں نہ وہ جفا اپنی | یہ ہوئی آن ہوئی نہ ہوجائے
اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں | عاشقی بندگی نہ ہوجائے

کہیں بیخود تمھاری خود داری
مانعِ بے خودی نہ ہوجائے

(۱۹۷) قطعہ

ازل میں داد و دہش کا جو حکم عام ہوا | تو سب کو مال ضروری علی الحساب ملا
کسی کو عالمِ طفلی کا عیش اور آرام | کسی کو راحت و عشرت بھرا شباب ملا
کسی نے دولت ارماں و آرزو پائی | کسی کو خلعتِ اندوہ و اضطراب ملا
کسی کے بانٹ میں قسمت سے شوخیاں آئیں | کسی کو شرم عنایت ہوئی حجاب ملا
کسی کی جان کو تکلیف انتظار ملی | کسی کے دل کو غمِ ہجر کا عذاب ملا
کسی کو پردہ نشینوں کا غم نصیب ہوا | کسی کو عشق رُخ یار بے نقاب ملا
جو عاصیوں کے اشارے میں معصیت آئی | تو زاہدوں کو طریق رہِ صواب ملا

کسی کی بات نے اعجاز عیسوی پایا
کسی کے قالب کو آزار التہاب ملا
کسی کو ذوق کباب جگر حصول ہوا
کسی کو شوق قدح نوشی شراب ملا
کسی نے عشوہ گر و کج نظر لقب پایا
کسی کو ہیچ دشور بدہ سر خطاب ملا
کسی کے بخت نے پائی سپہر کی گردش
کسی کے دل کو زمانے کا انقلاب ملا
کسی کو عقل کسی کو تمیز ہاتھ آئی
کسی کو ذہن ہزاروں میں انتخاب ملا
ملا کسی کو شرف جلوہ حسیناں سے
ذکا کسی کو بجز ضیا نور آفتاب ملا
غرض کہ سب نے کیا جسقدر خیال اس دن
ہر ایک اپنی مرادوں پہ کامیاب ملا
مگر نصیب سے ہیچ وہی وہ گیا محروم
نہ کچھ عذاب ہی پایا نہ کچھ ثواب ملا

پھر اب کہو کہ "دیا کیا" کسی نے کچھ نہ دیا
پھر اب کہو کہ "ملا کیا" فقط جواب ملا

(۷۲) احسان ۱۹۱۲ء

احسان منشی احسان علی خاں خلف منشی قاسم علیخاں آپ شاہجہانپور کے باشندے تھے ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں ولادت ہوئی حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کے شاگردان رشید سے تھے۔ شاہجہانپور میں مختاری کا پیشہ کرتے تھے وہیں ایک اُردو ماہوار رسالہ "ارمغان" کے نام سے جاری کیا تھا جو عرصہ تک جاری رہا۔ جولائی ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۰ھ میں

وفات پائی۔ دیوان اور رسالہ "تشبیہ یار" آپ کی یادگار ہیں۔

کلام یہ ہے:-

(۱۴۸) غزل

اس کو نہ سوچیے کہ ستم یا کرم ہوا
توڑا ہمارے دل کو بتوں نے ستم ہوا
اپنی گلی میں دیکھ کے ہم ہوتے ہیں خونکر
کیسا مری وفا نے پشیمان کر دیا
دونوں طرف ہے جب تو ہی دل ایک جان ایک
محرمِ عشق میری طرح دوسرا کہاں

خنجر اُٹھائیے سرِ تسلیم خم ہوا
وہ بھی اُنھیں کا قول اُنھیں کی قسم ہوا
نقشِ اُمیدِ یار کا نقشِ قدم ہوا
آنکھیں بھی اُنکی جھک گئیں غصہ بھی کم ہوا
مجھ پہ ستم ہوا تو تمھیں پر ستم ہوا
دل میں سرورِ وصل کبھی آیا تو غم ہوا

احساں ضبط کرنے سے خفائے رازِ عشق
دل سے بہت ہوا مگر آنکھوں سے کم ہوا

(۷۳) حالی ۱۹۱۴ء

حالی شمس العلماء خواجہ الطاف حسین خلف خواجہ ایزد بخش انصاری۔ مولد پانی پت ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں دہلی آگئے تھے۔ ابتدائً حضرت شیفتہ سے کلام میں

اِصلاح لیتے تھے. بعدہٗ اُردو فارسی دونوں کلام مرزا غالب کو دکھانے لگے اور آپ کے ارشد تلامذہ میں داخل ہوئے چالیس[۴۰] پینتالیس[۴۵] سال کی عمر تک قدیم طرز پر غزل کہتے رہے. بعہ ۱۸۷۹ء میں جبکہ سرسید احمد خاں مرحوم مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے ایک نئی روح پھونک رہے تھے اور مدرستہ العلوم علی گڈھ قایم ہوئے صرف چودہ[۱۴] سال گزرے تھے. حالیؔ پر سرسید کی نظر پڑی اور وہ یہ کہہ اُٹھے:-

اں دل کہ رم نمودے از خوبرو جوانان
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

اُسی زمانہ میں اُنھوں نے سرسید کی تحریک سے مسدس "مد و جزرِ اسلام" لکھا جس میں مسلمانوں کو اُن کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا نقشہ اس طرح دکھایا کہ سخت سے سخت دلوں میں تاثیر کی ایک بجلی دوڑ گئی. اُس مسدس کے شائع ہونے سے نہ صرف مسلمانوں میں ترقی کے جذبات پیدا ہوئے بلکہ اُردو نظم کی تاریخ میں قومی شاعری کی داغ بیل پڑ گئی. اس سے قبل اس قسم کی نظم اردو میں موجود نہ تھی. اور نہ اس وقت تک اس پایہ کی کوئی دلگداز قومی نظم اردو میں پائی جاتی ہے یہ وہی مسدس ہے جس کی نسبت سرسید نے مولانا حالیؔ کو اپنے خط مورخہ ۱۰ جون ۱۸۷۹ء میں لکھا تھا "بے شک میں اسکا محرک ہوا اور اسکو میں اپنے اعمالِ حسنہ میں سمجھتا ہوں جب خدا پوچھے گا کہ "تو کیا لایا" میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں" یہ مسدس مختلف مطابع میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہے ایک نفیس پاکٹ ایڈیشن ۱۹۰۶ء میں نامی پریس کانپور نے چھاپا تھا اس سے قبل اسی مطبع نے

ایسا ہی ایڈیشن رباعیات حالی کا بھی شایع کیا تھا جس کی ملک نے بہت قدر کی۔ مولانا حالی کا درجہ نثر نگاری میں کبھی کم نہ تھا۔ حیات جاوید۔ یادگار غالب وغیرہ اسکی شاہد ہیں۔ دیوان حالی مع ایک مبسوط مقدمہ کے ١٨٩٣ء میں نامی پریس میں طبع ہوا ہے۔ ٣٠ دسمبر ١٩١٤ء مطابق ١٣٣٢ھ کو خواجہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

انتخاب مد و جزر اسلام

(١٦٩) بعثت ختم المرسلین

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوےٰ
یتیموں کا والی۔ غلاموں کا مولےٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا　　کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا　　پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمّی
نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اُس کی جوہر تھے اعلیٰ
ہوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی

یہ تھا مثبتِ علمِ قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر
تمام اہلِ مکّہ کو ہمراہ لے کر
گیا اک دن حسبِ فرمانِ داور
سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر

یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب!
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب"

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سُنا اور نہ دیکھا
کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا
تو باور کروگے اگر میں کہوں گا

کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمھیں گھات پا کر"

کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے اور تو امیں ہے
کہا "گر مری بات یہ دل نشیں ہے
تو سُن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا

ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنے والا"

وہ بجلی کا کڑکا تھا۔ یا صوت ہادی — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی — اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نام حق سے

(۱۷۰) خلافت اُندلس

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے — مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے — خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

(۱۷۱) خلافت بغداد

وہ بلدہ کہ فخر بلاد جہاں تھا — تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس پہ عباسیوں کا نشاں تھا — عراق عرب جس سے رشک جناں تھا

اُڑا لے گئی باد پندار جس کو
بہا لے گئی سیل تاتار جس کو

سُنے گوشِ عبرت سے جا جا کے انساں
کہ تھا جن دنوں مہرِ اسلام تاباں
تو واں ذرہ ذرہ یہ کرتا ہے اعلاں
ہُوا یاں کی بھی زندگی بخش دوراں

پڑی خاکِ ایتھنز میں جاں یہیں سے
ہوا زندہ پھر نامِ یوناں یہیں سے

وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں
ارسطو کی تعلیم، سولن کے قانون
وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
پڑے تھے کسی قبرِ کہنہ میں مدفوں

یہیں آکے مہرِ سکوت اُن کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا سے بُو اُن کی چھوٹی

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن
نوشتوں سے ہے جن کے اب تک مزین
یہ تھا اُنکی کرنوں سے تا غرب روشن
کتب خانۂ پیرس و روم و لندن

پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

(۷۲) ملتِ اسلامیہ اور دیگر اقوام و ملل

ملے کوئی ٹیلا اگر ایسا اونچا
چڑھے اُس پہ پھر ایک خردمند دانا
کہ آتی ہو واں سے نظر ساری دنیا
کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا

تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ

کہ عالم کو زیر و زبر پاوے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن واں
بہت تازہ تر صورتِ باغِ رضواں
بہت اُن سے گنتر یہ سرسبز و خنداں
بہت خشک اور بے طراوت گریاں
نہیں لائے گو برگ و باراں کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار اُن کے بودے

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر
جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر
ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں آگ کا کام کرتا ہے باراں
جہاں آکے دیتا ہے رو ابرِ نیساں
تردد سے جو اور ہوتا ہے ویراں
نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آواز پیہم وہاں آرہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

وہ دینِ حجازی کا بیباک بیڑا
نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا
نہ عمّاں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا
کئے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

(۱۷۳) اُمید سے خطاب!

بس اگر نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو
ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو
جھلک اک ذرا اے امید اپنی آخر دکھا تو
فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سر سبز کی ہیں

سفینہ پئے نوح طوفاں میں تو تھی
زلیخا کی غمخوار ہجراں میں تو تھی
سکوں بخش یعقوب کنعاں میں تو تھی
دل آرام یوسف کی زنداں میں تو تھی

مصائب نے جب آن کر اُن کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے
اُکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے
بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

تو ہی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی
تجھی پر ہے بنیاد نظم جہاں کی
بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خورد و کلاں کی
نہ ہو تو - تو رونق نہ ہو اس جہاں کی

لگاؤ ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رَوا رَو ہے ہر قافلے میں تجھی سے

کسانوں سے کلّر میں تو ہی بوائی   جہازوں کو گرداب میں ہی کھوائی
سکندر کو دارا پہ ہی تو چڑھائی   فریدوں کو ضحاک سے ہی لڑائی

چلے سب جدھر تو نے مائل عناں کی
نظر تیری سیٹی پہ ہے کارواں کی

نوازا بہت بے نواؤں کو تو نے   تونگر بنایا گداؤں کو تو نے
دیا دست رس نارساؤں کو تو نے   کیا بادشہ ناخداؤں کو تو نے

سکندر کو شان کئی تو نے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تو نے بخشی

وہ رہرو نہیں رکھتے جو کوئی ساماں   خور و زاد سے جن کا خالی ہے داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں   نہ محرم کوئی جو سُنے درد پنہاں

ترے بل پہ خوش خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانہ ہے اب کوئی پاتے

زمیں جوتنے کو جب اُٹھتا ہے جوتا   سمیں کا گماں تک نہیں جب کہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہے جان کھوتا   مہینوں نہیں پاؤں پھیلا کے سوتا

اگر موجزن اُس کے دل میں نہ تو ہو
تو دُنیا میں غُل بھوک کا چار سو ہو

بنے اس سے بھی گر سوا اپنے دم پر   بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر

پہاڑ اک فنز دل اور ہو کوہِ غم پہ — گزرنی ہو جو کچھ گزر جائے ہم پہ

نہیں فکر۔ تو دل ٹھکانے ہی جب تک
دماغوں میں بُو تیری آتی ہے جب تک

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے — عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے
جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے — تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے

مگر اک امید ایک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا

(۱۷۴) قطعہ

ہوئی رلیاں جوانی کی بہار آخر حیف — طبع رنگیں تھی مے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں — جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی ہر اک حالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ — سر ہی سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر — نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو ہو وہ کہانی بے لطف — گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں — لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچئے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر — کیجئے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائیے جوانوں کے دل آتش کی طرح — وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہ کہیں ہو نہ ہماری وہ مثل — قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

(۱۷۵)

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو! دل نہ لگانا، نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
دیکھنا! شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک طلعت مکروہ ہے برقع میں نہاں
کسی دُنالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
نوجوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رہنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب!
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا! ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح
دیکھ! اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز
جسکو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں نظر آتا نہیں۔ ایک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں لگے گیا۔ اس پہ جہاں رقا ہے ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز
یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عشق و نشاط نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دہلی ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

(۱۷۶) قصیدہ عرض حال بجناب سرورِ کائنات صلعم

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہی
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہی

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہی

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمانِ سرائے فقرا ہی

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتّی نہ دیا ہی

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اُس کا نگہبان اگر ہی تو خدا ہی

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہی

جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہی

جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اسمیں بپا ہی

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی
اس دین میں اب فقر ہی باقی نہ غنا ہی

جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی
وہ عرصۂ تیغِ جُہلا و سفہا ہی

جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب
اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ درا ہی

ہی دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دینداروں میں پر آب ہی باقی نہ صفا ہی

عالم ہی سو بے عقل ہی جاہل ہی سو وحشی
منعم ہی سو مغرور ہے مُفلس سو گدا ہی

یاں راگ ہی دن رات تو واں رنگ شب و روز
یہ مجلسِ اعیان ہے وہ بزمِ شرفا ہی

چھوٹوں میں اطاعت ہی نہ شفقت ہی بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہی نہ یاروں میں وفا ہی

دولت ہی نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہی
اک دین ہی باقی سو وہ بے برگ و نوا ہی

ہی دین کی دولت سے بہا علم سے رونق
بے دولت و علم اس میں نہ رونق نہ بہا ہی

شاہد ہی اگر دین تو علم اس کا ہی زیور
زیور ہی اگر علم تو مال اس کی جلا ہی

جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت
اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہی

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہی

ڈر ہی کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہی

جس قصر کا تھا سر بہ فلک گنبدِ اقبال
ادبار کی اب گونج رہی اس میں صدا ہی

بیڑا تھا نہ جو بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہی اب چلتی خلاف اس کے ہوا ہی

وہ روشنیِ بام و درِ کشورِ اسلام
یاد آج تلک جس کی زمانے کو ضیا ہی

روشن نظر آتا نہیں واں کوئی چراغ آج
بجھنے کو ہی اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہی

عشرت کدے آباد تھے جس قوم کے ہر سو
اس قوم کا اک ایک گھر اب بزمِ عزا ہی

چاؤش تھے للکارتے جن رہ گزروں میں
دن رات بلند ان میں فقیروں کی صدا ہی

وہ قوم کہ آفاق میں جو سر بہ فلک تھی
وہ یاد میں اسلاف کی اب رو بہ قفا ہی

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتہ ہی

کھوج ان کے کمالات کا لگتا ہی اب اتنا
گم دشت میں اک قافلہ بے طبل و درا ہی

بگڑی ہی کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہی اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکمِ قضا ہی

تھی آس تو تھا خوف بھی ہمراہ رجا کے
اب خوف نہ ہی مدت سے دلوں میں رجا ہی

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہی

دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہی کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہی

کی زیب بدن سب نے ہی پوشاک کتاں کی
اور برف میں ڈوبی ہوئی کشور کی ہوا ہی

درکار ہی یاں معرکے میں جوشن و خفتاں
اور دوش پہ بار اُس کے وہی کہنہ ردا ہی

دریائے پُرآشوب ہی کہ اک راہ میں حائل
اور بیٹھ کے گھٹنوں پہ یاں قصدِ شنا ہی

ملتی نہیں اک بوند بھی پانی کی جہاں مفت
واں قافلہ سب گھر سے تہی دست چلا ہی

یہاں نکلے ہیں سودے کو درم لیکے پرانے
اور سکّہ واں شہر میں مدت سے نیا ہی

فریاد ہی اے کشتیِ اُمت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہی

اے چشمۂ رحمت بابی انت و اُمّی
دُنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہی

جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک اُن سے کیا ہی

صدمہ درِ دنداں کو ترے جن سے کہ پہونچا
کی اُن کے لئے تو نے بھلائی کی دعا ہی

کی تو نے خطا عفو ہی اُن کینہ کشوں کی
کھانے میں جنھوں نے کہ تجھے زہر دیا ہی

سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحم
ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہی

جو بے ادبی کرتے تھے اشعار میں تیری
منقول انھیں سے تری کچھ مدح و ثنا ہی

برتاؤ ترے جبکہ یہ اعدا سے ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ اُمید سوا ہی

کر حق سے دعا اُمتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جسکا جہاز آکے گھرا ہی

اُمت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہی

ایمان جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہی

ہر چپقلش دہر مخالف میں ترا نام
ہتھیار جوانوں کا ہی پیروں کا عصا ہی

جو خاک ترے در پہ ہی جاروب سے اُڑتی
وہ خاک ہمارے لئے داروئے شفا ہی

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرّف
اب تک وہی قبلہ تری اُمت کا رہا ہی

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبہ سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہی

کل دیکھیے پہنچائے غلاموں کو ترے کیا
اب تک ترے نام پہ ایک ایک فدا ہی

گر بد ہیں تو حق اپنا ہی کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار میں الطالح لی ہم نے سُنا ہی

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہی اگر حال بُرا ہی

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دُعا تیری کہ مقبول خدا ہی

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہی

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری
اُمت تری ہر حال میں راضی برضا ہی

عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلّت میں مزا ہی

ہاں حاؔلی گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہی

ہی یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب
یہاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہی

(۷۴) اوج ۱۹۱۷ء

اوج میرزا محمد جعفر خلف الرشید حضرت دبیر۔ عربی۔ فارسی کی اچھی استعداد تھی علم عروض میں کمال تھا اس فن میں آپ نے ایک رسالہ بھی تالیف کیا تھا جو اردو کی دنیا میں نہایت مقبول ہوا۔ جعفری بیگم صاحبہ کما وقاف سے ان کو مرثیہ خوانی کے صلہ میں ایکہزار روپیہ سالانہ ملتا تھا۔ بعض تعلقہ داران اودھ بھی قدردانی فرماتے تھے۔ اب اپنے باپ کے قابل فخر یادگار تھے سلام مرثیہ۔ رباعی سب کچھ کہتے تھے۔ مگر تمام اصناف سخن میں آپ کے سلام مطبوع خلائق ہوئے ستر برس کی عمر پائی ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۵ھ میں انتقال کیا۔

کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(۱۷۷) سلام

خواہشیں دنیا کی بارِ دوشِ گردن ہوگئیں
رفتہ رفتہ منزلِ عقبےٰ کی رہزن ہوگئیں
یہ ہوا کیسی چلی اس ننگنائے دہر میں
شہر جنگل ہوگئے۔ آبادیاں بن ہوگئیں
چل سوئے گورِ غریباں اے حریص مال و زر
دیکھ کتنی آرزوئیں نذرِ مدفن ہوگئیں

کیسی رنگا رنگ شکلیں ہونگی اے جوش بہار
مٹ کے جو گلگونۂ رخسارِ گلشن ہوگئیں
کھل نہیں سکتی کبھی کیفیت بغض و حسد
میری آہیں پردۂ ناموس دشمن ہوگئیں
میرے نغموں نے جو پائی قلب گلشن میں جگہ
شاخِ گُل پر بُلبُلیں بار نشیمن ہوگئیں
جب مرے نالے ہوئے قدِ صنوبر سے بلند
بلبلیں ساکن سرِ دیوارِ گلشن ہوگئیں
جامۂ ہستی ہوا صد چاک جب مثل سحر
زینتیں دنیا کی گردا گردِ دامن ہوگئیں
ہو سکے عون و محمد سے نہ سر بر زرہ پوش
حق میں بیٹوں کے دعائیں ماں کی جوشن ہوگئیں

(۷۵) اسمٰعیل ۱۹۱۷ء

اسمٰعیل. مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھ کے رہنے والے تھے ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں مدرس فارسی تھے جدید طرز کی نظم لکھنے والے شعرا میں

ممتاز تھے۔ اُردو کے ساتھ فارسی بھی کہتے تھے اُردو مدارس کے ابتدائی درجوں میں اُنکی مُصنفّہ کتابیں عرصے تک رائج رہیں۔ گورنمنٹ نے اُن کو "خان صاحب" کا خطاب دیا تھا۔ زبان کی سلاست مضامین کی سادگی سے کلام کو ایسی مقبولیت ہوئی ہو کہ بچّوں کو اُن کے اشعار نوکِ زبان ہو جاتے ہیں کلیاتِ اسمٰعیل نہایت اہتمام سے ۱۹۰۱ء میں چھپ چکی ہو یکم نومبر ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۵ھ کو انتقال ہو گیا۔

کلام کا انتخاب یہ ہو

(۱۷۸) غزل

جو بچھلے پہر سے کی اُٹکل نہ مرا اشعار ہوتا
نہ جزائے خیر پاتا۔ نہ گناہ گار ہوتا

مئے بیخودی کا ساقی! مجھے ایک جرعہ بس تھا
نہ کبھی نشہ اُترتا۔ نہ کبھی خمار ہوتا

میں کبھی کا مر بھی رہتا ز غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی کا مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشقِ جاں ستاں ہو یہ وہ بحرِ بے کراں ہو
نہ سُنا کوئی سفینہ کبھی اس سے پار ہوتا

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا تمھیں ناگوار ہوتا

ہو اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہی کاروبار ہوتا

(۱۷۹)

مانع سیر گشتنگی وہ تنگیِ در ہوتا نہیں
چھوڑنا سر کا علاجِ دردِ سر ہوتا نہیں

جیتے جی دنیا! ہائے عقبیٰ! منزلِ دلبر ہی دور
دل جو اٹکے رستے میں ٹھکے طے سفر ہوتا نہیں

یاد اور اُمید کی دولت سے کٹ جاتے ہیں دن
ورنہ غم کھانے سے دُنیا میں گزر ہوتا نہیں

دعویٰ اُلفت ہی کیا جو نہ ہو دل میں تپش
بے حرارت تو کبھی پختہ ثمر ہوتا نہیں

خوف جاتا ہے نامہ بر جانے کی ہامی کیوں بھرے
رشک سے یاں اعتبارِ نامہ بر ہوتا نہیں

صدمۂ دل کو بہ فرقت امتحانِ عشق ہی
بے لیسے ثمرہ بھی منظورِ نظر ہوتا نہیں

ہر شعورِ ما سوا بھی اک حجابِ آگہی
بے خبر جب تک نہ ہو لے باخبر ہوتا نہیں

(۱۸۰) اچھے دنوں کی یاد

ایامِ وصال بھی تھے کیا دن
راتیں تھیں مراد مدّعا دن

محسوس نہ تھا کہاں کٹی رات
معلوم نہ تھا کدھر گیا دن

کیا جلد گزر گئے وہ دن جیت!
ہوتا کوئی اور بھی سوا دن

تھی رات بہت دنوں سے اچھی
راتوں سے زیادہ خوب تھا دن

تھی بزمِ وصال۔ دن ہو یا رات
تھی دیدِ جمال شب ہو یا دن

دُنیا میں بزرگ تھی وہی رات
تھا عمر میں بس وہی بڑا دن

ہر صبح عجب۔ شام نادر
ہر رات جدید۔ اور نیا دن

تھی دن کو خوشی کہ اب ہوئی رات
تھی شب کو مسرت اب ہوا دن

عالم کو زبس کہ ہے تغیّر — رہتے نہیں ایک سے سدا دن
تھا خواب و خیال وہ زمانہ — بجلی ہوئی رات اور ہوا دن

دن رات ہی فغاں ہی لب پر
وہ رات رہی نہ وہ رہا دن

حصّۂ دوم

شعرائے حال کے کلام کا انتخاب

اِس حِصّہ میں اُن شعرا کو لیا گیا ہی جو بوقت ترتیب تذکرہ یعنی جولائی ۱۹۲۱ء تک زندہ تھے اُن کو بہ لحاظ تاریخ ولادت درج کیا گیا ہی لیکن نمبر سلسلہ دونوں حِصّوں کا ایک ہی رکھا گیا ہی

(۷۶) اکبر ۱۸۴۶ء

اکبر. خان بہادر مولوی سیّد اکبر حسین صاحب رضوی. دورِ موجودہ کے مشہور شاعر ہیں ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء مطابق ۱۲۶۲ھ کو الہ آباد میں پیدا ہوئے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام موسیٰ رضا تک پہونچتا ہے شاعری کے پردہ میں درستی اخلاق خاص ان کا حصہ ہی کلام میں جدت بیشتر ہے. لیکن ظرافت کو صحت زبان پر مقدم رکھتے ہیں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان ان کے کلام سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں. انگریزی الفاظ

اُردو میں کھپانے کی بہت کوشش کرتے ہیں۔ جدید محاورات جو انگریزی اختلاط سے اُردو میں پیدا ہوتے جاتے ہیں ان کے یہاں اسعار میں اکثر بندھے ہوئے ملیں گے حضرت وحید الہ آبادی شاگرد آتش سے تلمذ ہے دو دیوان شایع ہو چکے ہیں جو کلیات اکبر کے نام سے مطبوع خاص و عام ہیں صوبہ متحدہ میں جج رہے تھے ۱۹۰۵ء میں پنشن پائی ۱۸۹۸ء میں خان بہادری کا خطاب ملا

نمونہ کلام یہ ہے

غزل (۱۸۱)

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے سامان بہم ہونگے

نئے عنوان سے زینت دکھائینگے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہ جائیگی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہونگے

بدل جائیگا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہونگے

نہ پیدا ہوگی خط نسخ سے شان ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیب رقم ہونگے

خبر دیتی ہے تبدیل ہوا تحریک موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہونگے

عقائد پر قیامت ڈھائیگی ترمیم ملت کی
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے

بہت ہونگے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہونگے اس لئے بےتال ہم ہونگے

لہ اس تذکرہ کی تالیف کے وقت خان بہادر صاحب بقید حیات تھے لیکن مطبع میں مسودہ بھیج جانے کے بعد ۲۰ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انتقال ہوگیا۔

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
بدل جائیگا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی بھول جائینگے
کسی کو اس تغیّر کا نہ حس ہوگا، نہ غم ہوگا

لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب کم ہونگے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر بم ہونگے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

(۷۷) شادؔ ۱۸۴۶ء

سیّد علی محمد نام ہے ۔ سادات عظام سے ہیں ۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۲۳ واسطوں سے حضرت سیدنا امام زین العابدین سے ملتا ہے۔ سیّد حسین فیروزی بادشاہ عراق و فارس جن کا ذکر خواجہ حافظ شیرازی نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔ آپ کے اجداد میں تھے ۔ ؎

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی
خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

۱۹ / محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے فارسی عربی میں کامل استعداد ہے پنگل (عروض ہندی) سے بھی واقفیت ہے اپنے تصنیف کردہ اشعار کی تعداد مولانا نے خود ایک لاکھ سے چند ہزار زائد لکھی ہے۔ آپ کی تصانیف میں

تاریخ صوبہ بہار "مردم دیدہ" وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے حال میں ایک نئی کتاب "فکر بلیغ" لکھی ہے جس میں اردو کے تاریخی حالات ہیں انیس۔ دبیر، خلیق وغیرہ مشہور مرثیہ گو شعرا کے سوانح ان کے کلام سے انتخاب اور اس پر تنقید ہے۔ اس کی اشاعت سے اُردو ادب میں مفید اضافہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ آپ کا کلام دیوان کی صورت میں ابتک شائع نہیں ہوا ۱۸۹۱ء میں گورنمنٹ سے خان بہادری کا خطاب پایا اور ۱۸۹۳ء میں پبلک نے ادبی خدمات کا اعتراف کرکے سید الشعراء کے لقب سے ممتاز کیا

کلام کا نمونہ یہ ہے

غزل (۱۶۳)

ہم سے نہ حق ادا ہوا عشق کرشمہ ساز کا
شکوہ کریں تو کیا کریں جانِ بہانہ باز کا

ہجر میں کر دل حزیں جو بہت اخیر رو ہوا
لب کبھی ہلانا منع ہے تجھ سے امین راز کا

ہوگی جو اپنی آنکھ بند آئیگا نہ پھر کبھی
دیکھ سکا نہ ہو سماں دیدۂ نیم باز کا

بوسۂ سنگِ آستاں لے نہ سکا ہزار حیف
آگے قدم نہ بڑھ سکا ہمت سرفراز کا

اے دل مضطرب ٹھہر وقت سوال بھی تو ہو
مجھ کو بھی نام یاد ہے اپنے گدا نواز کا

جلوۂ حسن کی طرف دیکھ تو کچھ پتا چلے
جانے دے ولولہ نہ پوچھ عاشق پاکباز کا

کشتۂ چشم رہ گیا کھول کے آنکھ اسی طرح
ذکر کسی نے کیوں کیا اُن کی نگاہِ ناز کا

پار لگائے گا وہی اپنی شکستہ ناؤ بھی
دل کو بنایا ناخدا جس نے مرے جہاز کا

اُن کے پیام کا جواب کس نے کہا کہ نا دے | کوئی علاج کیا کرے ایسے زباں دراز کا
قصۂ ہجر تا کجا تھک بھی چکی مری زباں | ہو بھی تو خاتمہ کہیں اس گلۂ دراز کا
پیر مغاں کے معجزے دیکھ چکے ہو واعظو | تم نہ پیو جو تو خیر حکم تو دو جواز کا

خاک بہت سی چھان کر دشت و جبل سے ہم پھر آئے
شادؔ پتا ملا نہ آہ قافلۂ حجاز کا

(۱۸۳)

آئی خزاں بہار کا موسم نکل گیا | کیوں اے نسیم تیرا کلیجہ نہ ہل گیا
اس باغ میں بہار خزاں کچھ نئی نہیں | دل کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا
قاصد مریض عشق سدھارا جہاں سے | اب کے پیام وصل کا جادو نہ چل گیا

(۱۸۴)

سہی کس نے ہے کون تیری سہے گا | نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا
ترا نام کیوں غیر لے میرے آگے | مرا دل بھی دل ہے کچھ آخر کہے گا
زمانے سے ہم تو گزر جائیں گے خود | زمانہ مگر آپ کو کیا کہے گا

یہ دنیا ہے اے شادؔ ناحق نہ اُلجھو
ہر اک کچھ تو اپنی سی آخر کہے گا

(۱۸۵)

غفلت میں ہوئے اوقات بسر ای عمر گریزاں کچھ نہ کیا
کی فکرِ وصالِ یار بہت لیکن سر و ساماں کچھ نہ کیا
جنبش سے تری مقتل ہوتا اک آن میں دشتِ کرب و بلا
عشاق کی بیباکی کے عوض ای ابروئے براں کچھ نہ کیا
اُلٹا نہ عراق و شام و حلب دُنیا نہ ہوئی ویران تو کیا
جل تھل نہ لہو سے تو نے بھرا تو خونِ مسلماں کچھ نہ کیا
ای ننگ جہاں ای شاد بنا کچھ آئی تجھ کو شرم و حیا
ای جہلِ مرکب ای حیوان اسے بے خبر انساں کچھ نہ کیا

(۱۸۶)

وہ کیسی نعمت تھی ای محبت کہ جس نے ہر شخص کو مٹایا
نہ نیست ہونے کا جی میں کھٹکا نہ ہستی کا لطف کوئی پایا
نظر ہیں ویراں ہی بزم عالم بغیر دل کے یہ ہم نے پایا
جو دل پہ الزام ہی گیا کیوں ہمیں نے خود دیکھے کیا بنایا
اُمیدا در وہ بھی کس کی ای دل وصال ہی شے کی اف نہ کچھ کہہ
ہمیشہ دھوکے پہ کھائے دھوکے ہمیشہ رہ رہ کے آزمایا

کہاں یہ ریش سفید اپنی کہاں جوانوں کی بزم ساقی
بُرا ہو اس شوق کا الٰہی ہمیں بھی کافر لگا کے لایا
اُنھیں جو منظور دیکھنا ہو تو آ کے ایسے میں دیکھ جائیں
لیا سنبھالا مریض غم نے چراغ رہ رہ کے جھلملایا
بتاؤ للہ منصفی سے یہ تذکرہ کر رہا ہوں دل کا
یہی وفا تھی یہی مروت کہ بچھڑ کہ شامت زدہ نہ آیا

(۱۸۷)

ادھر بھی کاش اک دن وہ سراپا ناز آ نکلے
کبھی ہم سے غریبوں کے بھی دل کا حوصلہ نکلے

کہاں تاب و تواں کہ غم کا ہجراں کشیدہ ہوں
بہ آسانی دم اپنا اپنے تن سے اے خدا نکلے

عدم میں آ کے بھی خوف و رجا ہمراہ ہیں اپنے
ہنوز آلودہ ہیں نکلے بھی دنیا سے تو کیا نکلے

در و دیوار کی اُلفت نے بیخود کر دیا سب کو
ترے مہماں بہ مشکل تجھ سے اے مہماں سرا نکلے

عدو ناک کی بھی خواہی ہے مقصود باطن میں
بظاہر ہو زباں پر بددعا دل سے دعا نکلے

چھُری چلتی ہے یارب انتظار قتل میں دل پر
گھُٹا جاتا ہے دم کب دیکھیے تیغ قضا نکلے

وہ آنکھیں ہیں کہاں جن سے کھلے سب رازِ عالم کا
تماشا دیکھنے بیکار اس میلے کا آ نکلے

پنڈت اگر پھر نہ پوچھا اللہ کا جینا ہے کہ مرنا ہے
وفادارو اعدم میں جا کے تم بھی بے وفا نکلے

(۷۸) اثر ۱۸۴۹ء

اثر شمس العلمار جناب مولوی نواب سید امداد امام صاحب بہادر رئیس اعظم پٹنہ، ۹ اگست ۱۸۴۹ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ خاندان سادات کرام سے ہیں علوم مشرقی و مغربی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص فن طبابت میں بہت زیادہ توغل ہے ۵۴ برس سے خلق خدا کی طبی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کی شاعری کا خاص رنگ ہے فطری جذبات محققانہ مسائل عاشقانہ واردات کو تغزل کے رنگ میں نبھانا آپ ہی کا حصہ ہے اس کے ساتھ ہی بلند پروازی کو جو غزل سرائی کی جان ہے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے آپ کا دیوان چھپ چکا ہے شاعری کے فن میں آپ نے ایک کتاب "کاشف الحقائق" لکھی ہے جس میں مشہور شعرائے اردو کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔

(۱۸۸) غزل

یہی نہیں کہ دل کی دھڑکن رہے گی جبتک کہ جان ہے گی
یقیں ہے اس کا کہ بعد مردن لحد بھی اپنی تپاں رہے گی

بہار عیش و نشاط کیسی، شگفتہ کیوں ہوں گُلِ تمنّا
ترے گلستاں میں بلبلِ دل خزاں رہی ہے خزاں رہے گی

شبابِ شاعر ہے عہد پیری کلام کا زور کم نہ ہوگا
رہے گی جبتک کہ جاں بدن میں طبیعت اپنی رواں رہے گی

وہ نعمتیں ہیں تری خدایا کہ وجد ہوتا ہی جن سے دل کو
رہے گی فرطِ ادب سے رقصاں دہن میں جب تک زباں رہے گی

چھپاؤں میں لاکھ سوزِ غم کو فغاں کا شعلہ بھڑک اُٹھے گا
دل و جگر جب اثر جلیں گے یہ آگ کیوں کر نہاں رہے گی

(۱۸۹)

جفا پرور سے اُمیدِ وفا کیا
عدو کے جور کا تجھ سے گلا کیا

غرض نا دلدادگی کی جانتے ہیں
کروں میں اُن سے عرضِ مدعا کیا

نہیں جب جوہرِ مردم شناسی
ستائش ہائے دشمن کا گلا کیا

سیاہ ہے طالعِ نیکو جو معنی
شکایت ہائے بختِ نارسا کیا

عدو شکر نہ چومے دستِ قاتل
دہانِ زخم شورِ مرحبا کیا

سراپا جلوۂ رنگِ وفا ہی
دلِ خوں گشتہ کے آگے حنا کیا

صبا آوارہ و گل نذرِ صرصر
چمن کی ہو گئی اگلی ہوا کیا

فروغِ جلوۂ گل عارضی ہی
تماشائے بہارِ بے بقا کیا

عبث کرتی ہے بلبل ماتمِ گل
غمِ بربادیِ اہلِ فنا کیا

اثر موہوم ہی مضمونِ ہستی
نہیں معلوم ہی کیا اور فنا کیا

(۱۹۰)

جفائیں ہوتی ہیں گھٹتا ہے دم ایسا بھی ہوتا ہے
مگر مجھ پر جو ہے تیرا ستم ایسا بھی ہوتا ہے
عدو کے آتے ہی رونق ہماری تیری محفل کی
معاذ اللہ انساں کا قدم ایسا بھی ہوتا ہے
رکاوٹ ہے خلش ہے چھیڑ ہے ایذا پہ ایذا ہے
ستم اہلِ وفا پر دم بدم ایسا بھی ہوتا ہے
حسینوں کی جفائیں بھی تلوّن سے نہیں خالی
ستم کے بعد کرتے ہیں کرم ایسا بھی ہوتا ہے
نہ کر شکوہ ہماری بے سبب کی بدگمانی کا
محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے
نہ ہو دردِ جدائی سے جو واقف اس کو کیا کہئے
ہمیں وہ دیکھ کر کہتے ہیں غم ایسا بھی ہوتا ہے
بتوں کے ملنے جلنے پر نہ جانا اے دلِ ناداں
بڑھا کر ربط کر دیتے ہیں کم ایسا بھی ہوتا ہے
ہمیں بزمِ عدو میں وہ بلاتے ہیں تمنا سے
کرم ایسا بھی ہوتا ہے ستم ایسا بھی ہوتا ہے

ہوا کرتا ہے سب کچھ اے انیس اُس کی خدائی میں
کریں دعوئ خدائی کا صنم ایسا بھی ہوتا ہے

(۱۹۱)

اے نو رسیدگانِ جوانی ذرا سنو!
اک آن وہ تھا کہ ساقیٔ بزم تھے اپنے آپ
ملتا تھا لطفِ زیست ہمیں بھی شباب میں
پیتے تھے ہم شراب شبِ ماہتاب میں

وہ بت کہ دل کو حلقۂ دامِ بلا میں لائیں
زلفیں تھیں جن کی تا بہ کمر پیچ و تاب میں
آنکھوں کے سامنے سے الٰہی کدھر گئے
اب تو نظر بھی آتے نہیں ہم کو خواب میں

احباب بزم جتنے تھے سب ہو گئے ہوا
گویا شراب پیتے تھے جامِ حباب میں

ہر لحظہ اُن کی یاد میں روئیں نہ کیوں انیس
تصویریں اُن کی غرق ہیں چشمِ پُر آب میں

(۱۹۲)

سُنا حالِ دل پر کہا کچھ نہیں
مگر کان دھر کر سُنا کچھ نہیں

مقدر رہا جو تھا وہ تم نے کیا
تو تم سے ہم کو گلہ کچھ نہیں

شبِ ہجر ہوتا چلا میں فنا
سحر ہوتے ہوتے رہا کچھ نہیں

نہ گُل پر ہی جوبن نہ بلبل کو جوش
چمن کی وہ اگلی ہوا کچھ نہیں

عبادت خدا کی باُمیدِ حور　　مگر تجھ کو زاہد حیا کچھ نہیں
خدا اُن سے بندوں کو اپنے بچائے　　کہ نزدیک جن کے خدا کچھ نہیں
حسینوں سے انداز من پوچھئے　　جفا ہی جفا ہے وفا کچھ نہیں

بتوں کی پرستش کہاں تک اثر
مگر تجھ کو خوفِ خدا کچھ نہیں

(۱۹۳)

اپنی نظروں میں کھپے خود رُخِ زیبا ہو کر　　آپ کو دیکھتے ہیں آپ تماشا ہو کر
دیکھ ثابت قدمی اہلِ وفا کی اپنے　　تیرے کوچہ میں رہے نقشِ کفِ پا ہو کر
آپنے مطلب کا ہوا کرتا ہے دیوانہ کبھی　　قیس صحرا کو گیا کوچۂ لیلیٰ ہو کر
کیا ترا ساتھ ازل سے نہ ہوا تھا مجھ کو　　میں نہ پہچانوں تجھے تیرا شناسا ہو کر
دشت میں ڈھونڈتے جب قیس کو لیلیٰ نکلی　　رہنما شوق ہوا جادۂ صحرا ہو کر
ایک جانب سے محبت نہیں پاتی انجام　　میں ترا ہو کے رہوں تو رہے میرا ہو کر
طور ہی طور رہی صحرائے طلب میں اپنے　　ذرہ ذرہ اَرِنی کہتا ہے موسیٰ ہو کر
خضر و موسیٰ کی حکایت سے عیاں ہوتا ہے　　جلوہ فرمائیاں کیں آپ نے کیا کیا ہو کر

آج کیوں صحبتِ احباب پہ مرتا ہے اثر
زیرِ مدفن تجھے کل رہنا ہے تنہا ہو کر

(۷۹) حافظ ۱۸۵۲ء

حافظ۔ قاضی خلیل الدین حسن ولد قاضی لبشیر الدین احمد صدیقی عبید الرحمانی پیلی بھیت کے شہر نامی ہیں اور وہیں وکالت کرتے ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ بھی ہیں حافظ قرآن ہیں۔ دو مرتبہ حج کعبہ و زیارت روضۂ منورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کے نعت گو شعرا میں آپ کا کلام بہت مشہور ہو۔ اپنے ماموں قاضی ممتاز حسین صاحب ممتاز کے شاگرد ہیں۔ فارسی شعر گوئی کا بھی ملکہ ہو علم عروض و معانی و بیان پر عبور رہی نہایت ستھرا صاف اور پاکیزہ شعر کہتے ہیں۔ کلام کی تنقید اور شعر کے حسن و قبح سمجھنے میں خداداد ملکہ ہو۔ وضع دار خوش اخلاق ہیں ۷۹ سال کی عمر ہے پانچ دیوان نعتیہ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہو چکے ہیں چھٹا مرتب ہو۔ عاشقانہ شاعری چالیس برس سے ترک کر دی ہو۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۲۲ رجب ۱۲۶۸ھ مطابق ۵ رمضان سنہ ۱۲۶۸ھ ہو۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

(۱۹۴) رباعیات

دنیا تری قدرت کی تماشائی ہو چھائی ہوئی سب پر تری یکتائی ہو
جلوہ ہو دوئی میں بھی تری وحدت کا دو آنکھیں ہیں اور ایک بینائی ہو

سنہ افسوس کہ ۷ رجب ۱۳۴۵ھ م ۹ دسمبر ۱۹۲۵ء کو انتقال ہو گیا۔

(۱۹۵)

دُنیا سے ضرور کوچ کرنا اک روز	ہے سرحدِ ہستی سے گزرنا اک روز
جینے سے زیادہ قدر مرنے کی کرو	جینا ہے تمام عمر مرنا اک روز

(۱۹۶)

گوہر کو کرے جمع یہ جوہر ہے تو کیا	جب نفسِ غنی نہیں تونگر ہے تو کیا
جب جُود نہیں، کرم نہیں فیض نہیں	مٹھی میں جو غنچے کی طرح زر ہے تو کیا

(۱۹۷) غزل

دل کو حسرت آئی تھی کوتاہیِ تقدیر پر	جنبشِ مژگاں سے چل کر تیر پہونچے تیر پر
دانہ دانہ کر گئے جب قسمتیں کی تقسیمِ رزق	نام دیوانوں کا لکھا دانۂ زنجیر پر
دل کے پردے میں وہ صورت ہے کہ چھپ سکتی نہیں	ایک آئینہ لگا ہے صاف اس تصویر پر
روتے روتے بندھ گئی ہچکی دمِ عرضِ سوال	اور پھندا پڑ گیا اُلجھی ہوئی تقریر پر
جب کوئی آئی مصیبت آئی دل کو تاکتی	جب کبھی ٹوٹی خرابی ٹوٹی اس تعمیر پر
کل ہم آئے آج رخصت صبر اب کس پر کریں	ہجر کی تعجیل پر یا موت کی تاخیر پر

ہند سے حافظ دوبارہ چل کے آیا ہے حضور
اک نظر ہو اس گدائے بے نوائے پیر پر

(۸۰) شوقؔ ۱۸۵۳ء

شوقؔ۔ شیخ احمد علی ولد کاظم علی قدوائی قصبہ جگور ضلع بارہ بنکی کے باشندے ہیں تقریباً ۱۸۵۳ء ان کا سالِ ولادت ہے۔ فن شعر میں حضرت امیرؔ کے شاگرد ہیں۔ سادگی بے تکلفی اخلاقی جذبات کے سوا اُردو کے محاورے نظم میں خوب کھپاتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم بدایوں کے اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد ریاست رام پور میں طالب علمی کرتے رہے عرصہ ہوا کہ لکھنؤ میں آزاد نامی اخبار نکالا تھا اس کے بعد ریاست گڑھا اور بھوپال میں ملازم رہے فی الحال ریاست رام پور میں ہیں اور دفتر جامع اللغات میں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈراما قاسم و زہرا "مثنوی ترانۂ شوق" اور چند معنی خیز نظمیں ان کے افکار کا نتیجہ ہیں دیوان ہنوز شائع نہیں ہوا ہے[۱]

کلام کا انتخاب یہ ہے۔

(۱۹۸) غزل

روح کو آج ناز ہے اپنا وقار دیکھ کر	اُس نے چڑھائیں تیوریاں میرا مزار دیکھ کر
قصد گلہ نہ تھا مگر حشر میں جوش شوق سے	ہاتھ مرا نہ رک سکا دامن یار دیکھ کر

[۱] افسوس کہ اس وقت جبکہ اس تذکرہ کے طبع ثانی کی نوبت آئی شوقؔ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں آپکی تاریخ وفات ۲۰ راپریل ۱۹۲۵ء ہے۔ لیکن شکر ہے کہ ۱۹۲۰ء میں ان کا دیوان "فیضان شوق" شایع ہو گیا

دیکھ کے ایک بار انھیں دل سے تو ہاتھ دھو چکے	دیکھیے کیا گزرتی ہے دوسری بار دیکھ کر
آتے ہیں وہ تو پہلے ہی رنج سے صاف ہو رہو	آگے کہیں پلٹ نہ جائیں دل میں غبار دیکھ کر
وصل سے گزرے ہے تو خدا ہاں یہ شگون چاہیے	صبح کو ہم اٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر

کعبے کو جانا شوق ابھی بہت زندگی بخیر
ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ آئی بہار دیکھ کر

(۸۱) منشی سنہ ۱۸۵۳ء

شیخ امیر علی ولد شیخ محمد حسین وطن قدیم اکبرپور ضلع فیض آباد۔ مولد و مسکن لکھنؤ مفتی گنج پیدائش ۱۰ صفر سنہ ۱۲۷۰ھ مطابق سنہ ۱۸۵۳ء نظیر علی تاریخی نام ہے۔ منشی تخلص ہے فارسی و عربی میں اچھی دستگاہ ہے لکھنؤ کے مشہور شعرا کی صحبتیں دیکھی ہیں کسی سے تلمذ نہیں فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں کبھی کلام کے جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ عرصہ ہوا آپ کا ایک قصیدہ موسومہ نیرنگ روزگار جس میں زمانے کا نقشہ کھینچا گیا ہے احباب کے اصرار سے چھپا تھا۔ ۴۴ برس سے ترک وطن کر دیا ہے سالہا سال تک بمبئی میں رہے آجکل حیدرآباد مقیم ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

(۱۹۹) غزل

ذرا انصاف سے کہیے کہ ہمت کس کی نکلی	جفاؤں کے مقابل ہیں وفا تنہا اگر نکلی

اُبلنے کی جگہ طوفانِ عہدِ نوح کے آخر
تنور بیوہ کے پردے میں میری چشمِ تر نکلی

حسابِ غم کیا سب اپنا اپنا پاک یاروں نے
یہ دیکھو خوبیِ قسمت کہ باقی میرے سر نکلی

ہزاروں حسرتیں دل میں مرے مہمان بن بیٹھیں
نہ لائی تابِ مہمانوں کی جاں اور چھوڑ کر نکلی

(۲۰۰)

کیا حال پوچھتے ہو مجھ آشفتہ رنگ کا
سودائے زلف سر میں ہے اک شوخ و شنگ کا

پھیری نگاہِ ناز اس اندازِ خاص سے
جس سے پتا چلا نہ سکا صلح و جنگ کا

ان ہرزہ گوئیوں سے تو فتنی پڑھو درود
سمجھے ہوئے ہو کیا یہ زمانہ اُمنگ کا

(۲۰۱)

شرابِ ساقی و مطرب چھٹیں یہ ہو نہیں سکتا
سیہ نامہ مرا کیا ابرِ رحمت دھو نہیں سکتا

شہیدِ عشق ہوں گم گشتۂ وادیِ الفت ہوں
کہو خضر و مسیحا سے کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا

دلِ آشفتہ زلفِ پُرشکن کے پیچ میں آیا
قیامت تک تو پھندے سے نکلنا ہو نہیں سکتا

(۸۲) نظم ۱۸۵۵ء

نظم سید علی حیدر طباطبائی لکھنؤ کے رہنے والے خاندان سادات سے طباطبائی کی اولاد میں ہیں۔ مختلف مشرقی علوم میں مہارت رکھتے ہیں۔ فن شعر میں تحقیق کا درجہ حاصل ہے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔ آپ سب سے پہلے کلکتہ میں واجد علی شاہ کے شہزادوں کو عربی تعلیم دینے کے واسطے مقرر کئے گئے تھے ۱۸۸۷ء میں واجد علی شاہ کا انتقال ہوجانے پر حیدرآباد دکن چلے آئے یہاں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے نظام کالج کے عربی پروفیسر رہے ہیں۔ حیدر جنگ کا خطاب پایا ہے۔ آپ نے دیوان غالب اردو کی ایک مبسوط شرح لکھی ہے جس میں شاعرانہ نکات اور فنِ سخن کے متعلق قابل قدر معلومات کو جمع کیا ہے۔ غزلیات کے علاوہ عالیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ دیوان کا انتخاب مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ پریس علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔ ۳۰ محرم ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء تاریخ پیدائش ہے آپ علمی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے بعد ۱۹۳۳ء میں رحلت کر گئے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۲۰۲) جوشِ گل

وہ موسم ہے کہ خوبانِ چمن بنتے سنورتے ہیں
یہ عالم ہے کہ جیسے رنگ تصویر دل میں بھرتے ہیں
ہے خوابیدہ جو سبزہ آئینہ خانے میں شبنم کے
نفس دزدیدہ بادِ صبح کے جھونکے گزرتے ہیں
پرِ طوطی پہ ہوتا ہے دمِ طاؤس کا دھوکا
ہوا سے اُڑ کے برگِ گل جو سبزے پر بکھرتے ہیں

ملا ہی سبزۂ نوخیز کو کیا رنگ زنگاری
ہوا لگنے سے جب کی زخم دل لالے کے بھرتے ہیں

شگوفہ ریز ہو کر ڈالیاں مدہوش کرتی ہیں
کہ میکش جانتے ہیں طاق سے شیشے اترتے ہیں

نزاکت سے ادا سے جھوم کر کہتی ہی شاخ گل
یونہی اک جام پی کر رنگ مستوں کے نکھرتے ہیں

بشاشت کہہ رہی ہی چہرۂ گل کی ادھر دیکھو
یونہی محفل میں ہنس دیتے ہیں پیمانے جو بھرتے ہیں

چمن کی بڑھ کے شاخیں ایسے کرتی ہیں گلبازی
گلوں کی آئینہ داری پر طاؤس کرتے ہیں

گماں ہوتا ہی کی لشکر کشی باد بہاری نے
زرہ پوش آ ہی جاتا ہی جب بادل گزرتے ہیں

دم صبح بہاری ہی رخ خورشید پر نقاب افگن
کسی آئینے پر تار نفس جیسے بکھرتے ہیں

وہیں جا کر تھمے گا کاروان لالہ و گل بھی
نسیم صبح کے جھونکے جہاں جا کر ٹھہرتے ہیں

نہالان چمن کر لیں گے قبضہ سارے عالم کا
وہاں سے پھر نہیں ہٹتے جہاں پہ پاؤں دھرتے ہیں

زمیں پر پاؤں پھیلایا ہی گیسوئے لف سنبل نے
عنادل ان نوں آتے ہوئے گلشن میں ڈرتے ہیں

جواب جشن جم ہے گرمی ہنگامۂ گلشن
کہ لیکر کشتی مے تخت پریوں کے اترتے ہیں

عنادل مل چکے ہیں خاک میں جو کیا خبر ان کو
کہ شاخیں جھومتی ہیں پھول تربت پر بکھرتے ہیں

(۲۰۳)

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہہ دی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرے کا رنگ ہو کر
شباب پیری کا آنا جانا غضب کا پر درد ہے فسانہ
یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت۔ وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

جو راز دل سے زباں تک آیا تو اُس کو قابو میں پھر نہ پایا
زباں سے نکلا کلام بن کر۔ کماں سے چھوٹا خدنگ ہو کر

غضب ہی بحرِ فنا کا دھارا کہ مجھ کو اُلجھا کے پار اُتارا
نفس نے موجوں کا جال بن کر۔ لحد نے کام نہنگ ہو کر

جگر خراشی سے پائی فرصت نہ سینہ کاوی سے ناخنوں نے
گلا گریباں نے گھونٹ ڈالا جنوں کی شورش سے تنگ ہو کر

بدل کے دنیا نے ہمیں صدہا اُسے ڈرایا اُسے لبھایا
کبھی زنِ پیرزال بنکر۔ کبھی بتِ شوخ و شنگ ہو کر

اُٹھے تھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر تامل نہ چاہیے تھا
کہ رہ گئی میرے دل کی حسرت شہیدِ تیغِ درنگ ہو کر

جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجوم لیت ولعل میں حیدر
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل میں رہے دریغ دو رنگ ہو کر

(۲۴۰) گلاب کا پھول

قطعہ

گلگشتِ باغ میں نظر آیا یہ صبح دم	اک گل فرازِ شاخِ چمن آشکار ہے
پوچھا یہ میں نے دیکھ کے اسکا فروغِ حسن	کس نازنیں کا تو چراغِ مزار ہے

معلوم ہو رہا ہی گریباں کے چاک سے — شاید کسی کی خاک پہ تو سوگوار ہی
کہنے لگا کرے کوئی ماتم کسی کا کیا — اپنی ہی زیست کا نہیں کچھ اعتبار ہی
میں نے کہا ہمیشہ رہے یہ ترا شباب — کہنے لگا کہ چشم زدن کی بہار ہی
پوچھا یہ میں نے کان میں آئی ہی کیا صدا — بولا اجل اجل کی جہاں میں پکار ہے
پوچھا برنگ شعلہ تو لرزاں ہے کس لئے — بولا جگر میں زخم ہے پہلو میں خار ہی
میں نے کہا کہ زخم جگر کا ہی کیا سبب — کہنے لگا کہ تیغ قضا سے فگار ہی
میں نے کہا پھری یہ چھری کس گناہ پر — اُس نے کہا مشیت پروردگار ہی
پوچھا یہ رو کے میں نے کچھ اسکا نہیں علاج — بولا یہ منہ سے کہے وہ مجھے کیا اختیار ہی

میں نے کہا کہ حیف تو کہنے لگا کہ حیف
جائے قرار ہی نہ تو پائے فرار ہی

(۸۳) شہیر ۱۸۵۶ء

شہیر سید محمد نوح خلف سید رعایت علی ۔ آپ مچھلی شہر ضلع جونپور کے رئیس ہیں فن سخن میں حضرت منیر شکوہ آبادی سے تلمذ ہی فارسی عربی میں مناسب لیاقت ہی وکٹوریہ کالج اور آگرہ کالج میں انگریزی کی تعلیم پائی ہی۔ فرخ آباد کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے اور خواجہ بادشاہ سفیر خلف وزیر مرحوم کے ہمنشین رہے اور اُن سے بھی افادہ سخن حاصل کیا ہی

آپ کی تاریخ ولادت ۲۵ دسمبر ... ء مطابق ... ھ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۲۰۵) غزل

سرسبز پھر مرا شجرِ مدعا ہوا
آئی بہار زخمِ جگر پھر ہرا ہوا

سہرا اُسی کے سر ہو شہادت کا ان دنوں
تیرا شہیدِ ناز ہی دولھا بنا ہوا

تیرِ نگاہ دل سے جگر تک گزر گیا
آنکھوں نے انکی یہ بھی نہ جانا کہ کیا ہوا

اب تک خدا سے مانگوں میں کیونکر دعائے وصل
پتھر کے نیچے ہاتھ ہے میرا دبا ہوا

شاید عرق فشاں دمِ رفتار ہے وہ شوخ
فتنے کے عطر سے ہے زمانہ بسا ہوا

پہونچا دیا گلی میں تری جوشِ گریہ نے
طوفان بہر کشتیِ دل ناخدا ہوا

کیا سبز ابرِ اشک سے ہو کشتِ آرزو
جب آج تک نہ سبزۂ مژگاں ہرا ہوا

تعقید اس غزل میں ہوئی کیونکر اے شہیر
دل زلف کی گرہ میں ہے شاید پھنسا ہوا

(۲۰۶)

شب بلا داغِ آتشیں سے کبھی تیرگی میں کمی نہیں ہے
یہ کیسا اندھیر ہے مرے گھر کہ چاند ہے چاندنی نہیں ہے
جفائے معشوق کا گلہ کیا کہ امتحانِ وفا ہے اس میں
جو ہو محبت کی آزمایش۔ وہ داخلِ دشمنی نہیں ہے

جو دار د منصور کا فسانہ سُنا تو جی کانپ کانپ اٹھا
کہ دل لگانا ہو جان جوکھوں یہ کچھ ہنسی دل لگی نہیں ہو

نہ جس سے کچھ مجھ کو نفع راحت۔ نہ غیر کی جان کا ضرر کچھ
وہ دوستی دوستی نہیں ہو۔ وہ دشمنی دشمنی نہیں ہو

بھڑک اُٹھے گی یہ آگ اک دن لگائی ہو جو دل و جگر میں
کہ اندر اندر رسا کا رہی ہو۔ دبی ہوئی ہو جلی نہیں ہو

یہی ہو دِل سوز سوزِ فرقت یہی ہو ہمدرد دردِ ہجراں
رہے سلامت اجل ہماری۔ ہمیں غمِ بے کسی نہیں ہو

نہیں رہی ہائے وہ جوانی کہ جس سے تھا لطفِ زندگانی
شہیر پیری وبال جاں ہو۔ کہ جان ہی زیست کی نہیں ہو

(۴۸) شاد سنہ ۱۸۶۲ء

شادؔ۔ سر مہاراجہ بہادر کشن پرشاد یمین السلطنت پیشکار و سابق مدار المہام دکن۔ آپ مہاراجہ چندو لال آنجہانی کے نواسے اور جانشین ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸ ماہ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ بروز پنجشنبہ مطابق سنہ ۱۸۶۲ عیسوی کو حیدر آباد میں ہوئی۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی کے سوا

اور کئی چند زبانوں پر عبور ہی۔ اردو فارسی اور برجبھاشا میں نظم و نثر قلم برداشتہ لکھتے ہیں آپ کی طبیعت کا رجحان تصوف کی طرف بہت بڑھا ہوا ہی۔ بزرگوں کی خدمت اور کتب بینی نے آپ کے اس رنگ کو خوب پختہ کر دیا ہی۔ فن سخن سے خداداد مناسبت ہی حضرت آصف غفران مکان سے شرف تلمذ ہی طرز جدید و قدیم دونوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں نظم و نثر کی متعدد تصانیف کے منجملہ آپ کا دیوان نعتیہ موسوم "بہ خمکدۂ رحمت" رباعیات شاد کلام شاد۔ بزم خیال۔ بیاض شاد۔ مخزن القوافی وغیرہ شائع ہو چکی ہیں کلام میں سلاست کا حصہ بہت زیادہ ہی جو آپ کی روانی طبع کا شاہد عادل ہی۔ کلام کو ہوا و ہوس کے اُن شرمناک مضامین سے جن سے روحانیت شعر فنا ہو جاتی ہی آلودہ نہیں ہونے دیتے۔

نمونہ کلام یہ ہی:-

(۲۰۷) غزل

بادۂ خمخانۂ توحید کا مے نوش ہوں
چور ہوں مستی میں ایسا بیخود و مدہوش ہوں

گہ بھر نہ دے مجھے ساقی یہ میرا فرض ہی
مثل ساغر دور میں ہوں بادۂ سر جوش ہوں

طرز خاموشی مری بتلاتی ہی اس راز کو
ہوں نوا سنجِ حقیقت لاکھ میں خاموش ہوں

درد مندِ عشق ہوں نالے کا خوگر ہوں میں
صورتِ سیماب ہو کر بیکل خاموش ہوں

کسکی فرقت وصل کس دلدار ہی معشوق کون
شاد میں اس عالمِ تکویں کا ہم آغوش ہوں

(۲۰۸)

اگر ظاہر نہ ہر صورت میں صورت آفریں ہوتا
تمہارے وصل کا ہنگام یقیں ہوتا یقیں ہوتا
کسی کا ہو کے رہنا یا کسی کو اپنا کر رکھنا
پلٹ کر دیکھ لیتا جانے جب وہ گھر مرا قاتل
نکلتا ناوکِ انداز گر نیچی نظر سے بھی
جو وہ بے پردہ ہو جاتا کلیم اللہ کی خاطر
حسیں ہیں ہر دلا کھوں نہیں کوئی اک آدھ ملتا ہے
اگر پردہ دوئی کا دور ہو جاتا نگاہوں سے
کہاں ممکن ہے صبر و عشق دونوں کا باہم ہونا
نہ لیتا امتحاں دونوں اگر شیخ و برہمن کا
ہوا اول ہوا آخر ہوا ظاہر ہوا باطن

پتا اسکا کہیں ملتا نشاں اسکا کہیں ہوتا
کسی تدبیر سے بھی نہ کر خطِ جبیں ہوتا
وہ تم سے ہو نہیں سکتا جو مجھ سے نہیں ہوتا
تجھے تجھ سے بھی شکوہ ہو گر وہ اپسیں ہوتا
تو دل کے پار ہوتا گر نہ ہوتا دلنشیں ہوتا
قیامت بھی قیامت کا تماشا پھر دیں ہوتا
محبت کا اثر ہر ایک کے دل پر نہیں ہوتا
نہ مجنوں کو نہ ہجرِ لیلیٰ دلِ محمل نشیں ہوتا
جو یہ ہوتے نہیں ہوتا جو وہ ہوتے نہیں ہوتا
نرالی ہے یہ کیسے پھر امتیازِ کفر و دیں ہوتا
یہ ظاہر ہو گئے پھر بھی کہیں ظاہر نہیں ہوتا

عبادت کیلئے بھی شاد اطمینان لازم ہے
پریشانی ہو کچھ بھی کام ہو دل سے نہیں ہوتا

(۲۰۹)

اُس چشمِ سرمگیں سے میں سرمہ در گلو ہوں
اک شے عطائے نایاب آوارہ کر رہا ہوں

دل میں ہے آرزو پر خاموش گفتگو ہوں
جسکی طلب میں ہر دم سرگرم جستجو ہوں

غفلت ہے کس بلا کی اتنی خبر نہیں ہے
اپنا ہوں آپ عاشق معشوق بھی ہوں اپنا
دل میں نہیں سمائی ہے جوش پر مئے عشق
اقرب ہے گر شاہ رگ سے ہے دور ہر مکاں سے
ہوں [illegible] نصیب اپنا
دونوں جہاں ہیں مجھ میں نیرنگیاں ہیں مجھ میں
نغمے بھرے ہیں مجھ میں اسرار قدرتی کے
ذاتی کی خندگی گر دے خبر کوئی پوچھے

کھویا ہے کس کو میں نے کیوں محو جستجو ہوں
کس کی طلب ہے دل میں اپنی میں آرزو ہوں
اس میکدے میں ساقی لبریز اک سبو ہوں
ڈھونڈوں کہاں ہے جس کو اپنی میں جستجو ہوں
پایا نہیں ہوں اس کو گو محو جستجو ہوں
عالم کا ہوں تماشا عالم کی آرزو ہوں
تار نفس سے ہر دم اک ساز گفتگو ہوں
اب تک لگے جہاں ہیں افسردہ میں لہو ہوں

ہے کون دوست میرا دشمن ہے کون میرا
ہوں دوست شاد اپنا اپنا ہی میں عدو ہوں

(۸۵) بے نظیر ۱۸۶۳ء

سید محمد بے نظیر شاہ وارثی سال پیدائش ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء عیسوی عربی فارسی کے فاضل ہیں انگریزی بھی جانتے ہیں۔ علم طب بھی پڑھا ہے اس کے متعلق آپ کو جدید نباتات کی تحقیقات کا شوق ہے۔ اصلی وطن کنٹرہ مانک پور ضلع الہ آباد ہے مدتوں سے حیدرآباد میں قیام ہے۔ فن شعر میں خاصی مہارت ہے۔ اردو غزل میں آپ مولانا

وجہ اللہ الہ آبادی مرحوم سے مشورہ لیتے تھے۔ قصیدہ اور مثنوی میں اکثر منشی امیر احمد مینائی سے اصلاح لی ہے۔ آپ کے کلام کا بہت بڑا حصہ ۱۸۹۵ء میں ایک سفر کے دوران میں گم ہو گیا۔ ایک مثنوی الکلام جس میں جابجا مناظر قدرت اور صحیح جذبات کی تصویریں کھینچی گئی ہیں ۱۳۱۳ھ میں نول کشور پریس میں طبع ہوئی ہے جس کا انتخاب ذیل میں دیا گیا ہے۔

غزل کا نمونہ یہ ہے۔

غزل (۲۱۰)

نہ رہا حجاب نیاز بھی جو نگاہ اہل نیاز میں
تو رہا نہ تیرے سوا کوئی پس پردہ حسن مجاز میں

وہی عین ہے جو خیال ہے یہ مری حقیقت حال ہے
کہ شراب ہے دم مے کشی تو نماز ہوں میں نماز میں

نہ ہوا بنی آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہے یہی خم ہے زلف ایاز میں

یہ عجیب پردہ حال ہے کہ نقاب حسن جمال ہے
جو نہاں بھی ہو کے عیاں ہے تو وہ راز ہے کوئی راز میں

یہ جہاں نہیں یہ ہے آئنہ ہے تصور ہمہ وا ہمہ
وہی جلوہ آئنہ ساز کا ہے نگاہ آئنہ ساز میں

ہمہ تن تصور دید ہوں طرب آشنائے نوید ہوں
کہ ترانہ کن ہے خشیاں سحر دل کے پردہ راز میں

مرے جرم کیا ہیں گناہ کیا تری شان لطف پہ ہیں فدا
کہ جلال ہے یہ بجا کچھ کمی نہیں ہے سما ترے عفو بندہ نواز میں

جو اسیر بند بلا ہوئے وہی قید غم سے رہا ہوئے
وہ پھنسے رہے جو پھنسے نہ تھے ترے دام زلف دراز میں

تو چراغ دیر و حرم رہے تجھے کیا پڑی ہے جو تو سنے
کہ تمام رات بسر ہوئی ہے کسی کے سوز و گداز میں

پس مرگ داد وفا ملی یہ مراد دست دعا ملی
کہ تری وفا نے اٹھا لئے مرے پھول دامن ناز میں

نہ عروج کچھ نہ نزول ہے یہ خیال و وہم فضول ہے ۔۔۔ جو بلندیاں ہیں نشیب ہیں وہی پستیاں ہیں فراز میں
تری شکل کھینچ کے رکھ دیا جو قلم قضا نے سبب یہ تھا ۔۔۔ کوئی نقش حسن نہیں رہا ہے کمال نقش طراز میں
یہ نوا جو شعلہ فروز ہے یہ دھنیں جو سامنے سوز ہیں ۔۔۔ مرے سوز دل کی آگ ہے تمہ راگ ہیں مرے ساز میں
دل نارہند میں کیوں ڈرے مجھے دفن کوئی کہیں کرے ۔۔۔ مری خاک بھی کی روح بھی ترے در پہ ہوگی حجاز میں
جو بنا یہاں ہی مٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا ۔۔۔ یہی ہے نظیر رواج ہو رہِ عشق شعبدہ باز میں

(۲۱۱)

کیوں اس قدر جہاں کی خاطر پہ بار ہوں ۔۔۔ نہ فراق ہوں نہ ترا انتظار ہوں
داغوں سے رنج و یاس کے میں لالہ زار ہوں ۔۔۔ اس پہ یہ داغ ہے تری آنکھوں میں خار ہوں
کیا ہوگی اس غریب کی بربادیٔ چمن ۔۔۔ دعویٰ کہ جہاں خزاں کو یہ ہو میں بہار ہوں
یوں اس گلی کی خاک میں پامال سب کے چل گئے ۔۔۔ ہر ذرہ کہہ رہا ہے کہ میں اک مزار ہوں
برباد ہو کے بھی مجھے اچھی جگہ ملی ۔۔۔ دل سے ترے نکل نہ سکا وہ غبار ہوں
کر لینگی خود اسیر مری نغمہ سنجیاں ۔۔۔ صیاد گر ہے ایک تو میں بھی ہزار ہوں
آتے ہیں بدلیوں کے دن اے شوق مبارک ۔۔۔ گھوڑے پہ میں ہوا کے ابھی سے سوار ہوں
کیا شے ہے دردِ عشق مجھے کچھ خبر نہیں ۔۔۔ کچھ تو مگر ضرور ہے جو بے قرار ہوں
کیا کم یہ اجر حسرتِ دیدار کا ملا ۔۔۔ یہ بھی بہت ہے جو تری آنکھوں میں خار ہوں
یاد آ گئی وہ جنبشِ ابرو غضب ہوا ۔۔۔ ہر آرزو یہ کہتی ہے خنجر کی دھار ہوں

بے ہوش ہو رہا ہوں خیالِ نگار میں
چھایا ہے سارے باغ پہ رنگِ فغاں مرا
ساقی جو پی ہو غیرت انکھوں سے نہ حرام
دنیا سے اُٹھ گیا ہوں فقط اس خیال سے
جو مُردہ آرزو تھی وہ میرے ہی دل میں ہے
اے آفتاب پر بھی یہ کہتی ہے کہکشاں
خود اپنے دل کی آگ سے جلتا ہوں رات دن
ساقی وہ آفتاب چھپا وہ اذاں ہوئی

اللہ ہی جواب میں کبھی ہوشیار ہوں
اس سے غرض نہیں کہ خزاں میں بہار ہوں
رندی میں بھی یہ آن ہے پرہیزگار ہوں
ایسا نہ ہو کہ آپ کی خاطر پہ بار ہوں
دنیا کی حسرتوں کا میں گویا مزار ہوں
اترا ہوا کسی کے گلے کا میں ہار ہوں
رونق ہوں باغِ دہر کی لیکن خزاں ہوں
دے جلد بھر کے جام کہ میں روزہ دار ہوں

زخمی تڑپ رہا ہوں مگر آہ بے نظیر
یہ بھی خبر نہیں کہ میں کس کا شکار ہوں

(۲۱۲)

نہ رہے اکیلے جنوں [illegible] یہ تماشہ ہم سفر [illegible] رہی
خرد و حواس جو چھن سے تو بلا سے بے خبری رہی
ہوئے خشک پھول چمن جلا کہیں نام کو نہ تری رہی
یہی اپنے زخم ہرے رہے یہی اپنی آنکھ بھری رہی
وہ تری گلی کی ذیا منیں کہ لحد سے مردے نکل گئے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شراب ساغر دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

نہ کدورت اپنی وفا میں ہے نہ غبار اپنی صفا میں ہے
اسے حسن قدر بھی کسا گیا یہ کسوٹیوں پہ کھری رہی

جو تمیز حال ہوا ہوئی ۔ طلب سکون بھی فنا ہوئی
نہ دماغ میں وہ جنون رہا نہ خیال میں وہ پری رہی

وہ ملال تھا کہ نکل گیا وہ خیال تھا کہ بدل گیا
مرے شکوے اپنے کبھی نہ تھے پہ طبیعت انکی بھری رہی

مری فرد جرم کو دیکھ کر یہ خیال تھا کہ انھیں نظر
یہی ایک شکل امید تھی وہی آج تک نظری رہی

تری تیغ بھی کوئی خضر تھی ۔ یہ اثر جو جی کے دکھا گئی
کوئی پنکھڑی گل زخم کی ہوئی خشک بھی تو ہری رہی

رہے باخبر تو نہ یہ کھلا کہ مآل و غایت عشق کیا
ہوئے بے خبر تو خبر ہوئی کہ خبر سے بے خبری رہی

کوئی حشر تک بھی نہ لکھ سکا مرے کار بد تو کھلا ہوا
کہ قرار داد گناہ سے مری فرد جرم بری رہی

تری چشمِ مست کی یاد تھی مری روح نزع میں شاد تھی
کہ شراب گو نہ میں پی سکا مرے سامنے تو بھری رہی

مجھے پاسِ وضع ضرور تھا یہ کمالِ عقل و شعور تھا
مری پردہ پوشیٔ جنوں ۔ مری عشق پردہ دری رہی

تری خاکِ در مجھے مل گئی تو ہوس نہ دل میں رہی کوئی
نہ وہ کیمیا کی طلب رہی نہ طلب کی دربدری رہی

وہ ہزار در پئے کیں رہا وہ ہزار پردہ نشیں رہا
وہی بے نظیرِ حزیں رہا وہی اس کی جلوہ گری رہی

(۲۱۴)

اس جگہ آ گرے ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے
وہ نکل جاتے ہیں اکثر سر کو ٹھکراتے ہوئے

اتنی مدت تو جنوں میں بھی رہا پابند وضع
شرم آتی ہے مجھے اب ہوش میں آتے ہوئے

دیکھنا اُس سے نہ کہہ دے کوئی میرے منہ کی بات
یہ بھی کہہ دیتے ہیں مجھ کو یاد فرماتے ہوئے

کچھ نہ لایا ساتھ کوئی ۔ کچھ نہ کوئی لے گیا
دیکھ ڈالے سیکڑوں آتے ہوئے جاتے ہوئے

تیرے مجنوں اب چمن کی سیر کے بھوکے نہیں
مدتیں گزریں بیاباں کی ہوا کھاتے ہوئے

ہم نہ سمجھے تھے کہ بن جائے گی تیری جان پر
خیر اتنا تو کہا ظالم نے شرماتے ہوئے

مُنعِ پھولوں کی قدر دانی دیکھنا ابرِ بہار
لے چلے میرا جنازہ پھول برساتے ہوئے

کر لئے پہلے تو ہر حلقے میں لاکھوں دل اسیر
اب اُلجھتے ہیں وہ گیسو انھوں کو سلجھاتے ہوئے

اس لئے وہ پوچھتے ہیں ظلم اپنے بار بار
رنج ہوتا ہے مجھے یہ قصّہ دہراتے ہوئے

معذرت اپنی نہیں ہوتی ہے کامل اے اُمید
دیر لگتی ہے وہاں کیا رحم فرماتے ہوئے

اس سفر میں ہر قدم پر دل گیا توشہ ہمیں
پہونچے منزل پر برابر ٹھوکریں کھاتے ہوئے

تنگ تھا میدانِ عالم اے جنوں تو کس لئے
وسعتِ صحرا نہ دیکھی پاؤں پھیلاتے ہوئے

اس قدر ناکامیوں کا خوف رہتا ہے کہ اب
دل میں ڈرتا ہوں خیالِ آرزو لاتے ہوئے

آمد و شد میں جہاں کی صرف دو دم کا ہے فرق
ایک دم آتے ہوئے اور ایک دم جاتے ہوئے

مٹ گئے پامالیوں سے وہ بھی آخر بے نظیر
کچھ نشاں تھے جنکی قبروں کے اُدھر جاتے ہوئے

(۲۱۴)

ترے رخ پہ جم کر نظر رہ گئی
کبھی ہم سے او فتنہ گر رہ گئی

ادھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

ازل میں ہر انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

نہ کچھ بھی رہا تو بھی سب کچھ رہا
تری یاد دل میں مگر رہ گئی

کمی کر گئی کیوں نگاہِ عتاب
پہونچ کر سناں تا جگر رہ گئی

کبھی کہہ دیا تھا کہ مرتا ہوں میں
شکایت انھیں عمر بھر رہ گئی

مرا اُٹھنے کو اُٹھا تو اس بزم سے
طبیعت وہیں بیٹھ کر رہ گئی

کہا اُس نے دھوکے سے بالیں پہ قم
تری بات اے چارہ گر رہ گئی

ادا سے وہ ٹھکرا کے چلتے ہوئے
قیامت مری جان پر رہ گئی

پھنسی دل میں تیری سناں ٹوٹ کر
یہ ظالم نہ رہتی مگر رہ گئی

مصیبت کوئی بھی دو دن جائے گی
مرے ساتھ کچھ دن اگر رہ گئی

کہاں جا کے ٹھنڈی ہوئی آہ گرم
پہونچکر قریب اثر رہ گئی

خدا جانے آنکھوں میں اب کیا رہا
نظر تو ترے بام پر رہ گئی

پھر آئی نہ غربت میں یاد وطن
وہ کم بخت بھی جا کے گھر رہ گئی

تری شام گیسو کی خوشبو کہاں
گلوں تک نسیم سحر رہ گئی

غنیمت ہے جس کو عداوت نہ ہو
محبت بس اب اس قدر رہ گئی

یہ کیا کم سزا سر بلندی کی ہے
کہ جھک کر فلک کی کمر رہ گئی

چلا جب یہ کہکر پکارا اسے
یہ بات اور اے نامہ بر رہ گئی

بلا ہی بلا تھی محبت تری
وہ قسمت سے میرے ہی سر رہ گئی

کوئی دم میں ہے ختم طول حیات
یہ منزل بہت مختصر رہ گئی

یہ کہتی ہے ہر داستانِ کہن
مسافر سدھارے خبر رہ گئی

کہاں عشق میں عقل کو یہ خبر
گئی کس قدر کس قدر رہ گئی

اٹھے ہو گئے مایوس ہر در سے ہم
بس اب اک تری رہ گزر رہ گئی

بڑی خیر گزری کرا ہی ضبط آہ
انھیں ہوتے ہوتے خبر رہ گئی

نہ توڑا انھیں غم سے بے نظیر
محبت میں اتنی کسر رہ گئی

"انتخاب از مثنوی الکلام"

(۲۲۵) برسات کا سماں!!

جو سوکھی زمیں پر ترشح ہوا — نکلتی ہے بو سوندھی سوندھی سی کیا
گرجتے ہیں بادل چمکتی ہے برق — ہوا صحن کا صحن پانی میں غرق
گئی نیند اُچٹ پانی کے شور سے — بہے جاتی ہیں نالیاں زور سے
ٹپکتی ہے بنگلے کی وہ اولتی — کہ ہے تابہ سیمین کی چلمن پڑی
ہوا زور سے چلتی ہے بار بار — پہنچتی ہے کمروں کے اندر پھوار
بنا ہے جو وہ ٹین کا سائبان — ہے اس وقت ارگن کا اس پر گمان
عجب لے سے پانی برستا ہے آج — کہ زاہد بھی مے کو ترستا ہے آج
چٹانوں پہ کیا لطف نظارہ ہے — کہ جو بوند ہے ایک فوارہ ہے
صبا کے طمانچے جو کھاتے ہیں آج — تو پودے سروں کو جھکاتے ہیں آج
چلی آتی ہے بدلیوں کی قطار — ہوا کے ہیں گھوڑے پہ بادل سوار
دھواں دھار اس وقت چھایا ہے ابر — فلک پر سیہ مست آیا ہے ابر
اُٹھی شاخِ گل سبزے کو چوم کر — برستی ہے کیا کیا گھٹا جھوم کر
ہیں آراستہ سبز پوشانِ باغ — ہوا غسل سے ہر شجر کو فراغ
بکایک رکی بوند ٹھہری ہوا — نظر آتی ہے اور ہی کچھ فضا

(۲۱۶) صبح کے وقت طلوعِ آفتاب کا منظر

ہے کچھ دھوپ کا عکس کہسار پر
شعاعیں چمکتی ہیں اشجار پر

تری اوس کی دھوپ کھونے لگی
ہوا بھی ذرا گرم ہونے لگی

پرندے زمیں پر اُترنے لگے
ہرن کھل کے جنگل میں چرنے لگے

اُڑے کھول کر بازو سرخاب پر
گرے مرغِ آبی وہ تالاب پر

وہ کھیتوں میں چڑیاں چہکنے لگیں
وہ چُن چُن کے دانے اُٹھانے لگیں

ہوا پھر وہی کاروبارِ جہاں
ہوئے لوگ مصروفِ کارِ جہاں

ہوا ہے ابھی تک نہیں کچھ غبار
رطوبت لگی اُٹھنے بن کر بخار

مگر شہر میں ہے نہیں آب و تاب
کہ ٹیلوں کی ہے اوٹ میں آفتاب

بلندی پہ کچھ دھوپ آنے لگی
وہ کلسوں پہ سونا چڑھانے لگی

منڈیروں پہ کچھ کچھ جھلکنے لگی
اُٹھ کر وہ در پر چمکنے لگی

(۸۶) ریاض ۱۸۶۳ء

ریاض۔ منشی ریاض احمد خلف سید طفیل احمد خیرآبادی سابق ایڈیٹر ریاض الاخبار۔ عاشقانہ معاملات رندانہ مضامین خوب ادا کرتے ہیں۔ امیر مینائی کے شاگردوں میں ممتاز ہیں

کلام میں شوخی کا پورا اندازہ ہے۔ کہنہ مشق ہیں۔ اب محمود آباد کی ریاست سے وظیفہ پاتے ہیں اپنے وطن خیرآباد میں مقیم ہیں۔ دیوان زیر طبع ہے۔ سال پیدائش تقریباً ۱۸۵۳ء مطابق ۱۲۶۹ھ ہے نمونہ کلام یہ ہے۔ (افسوس کہ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوگیا)

غزل (۲۱۷)

تربت ہماری دیدۂ حسرت چمن میں تھی
محتاجِ چار پھولوں کی تربت چمن میں تھی

اُجڑا جب آشیاں تو خزاں کیا بہار کیا
تنکوں سے آشیاں کے محبت چمن میں تھی

جینا نہ پھول پاؤں گے کانٹے نکالنا
اب جوشِ گل مجھے کہیں فرصت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مرے سپرد
تنگ آگئے جنوں چمن کے یہ خدمت چمن میں تھی

ہم بیٹھے کنجِ باغ میں اٹھتے تھے چپکے ہم
بزمِ چمن سے دور یہ خلوت چمن میں تھی

صیاد گھر ترا مجھے جنت سہی مگر
جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

چنگاریاں جو باغ میں پھیلی تھیں پھول تھے
یادِ بہار کی یہ شرارت چمن میں تھی

قیدِ چمن میں جان بھی نکلی جو صحبت سے
رکھی ہوا پہ قفس میں جو الفت چمن میں تھی

رہتا تھا ہم سے دور بہت شورِ اضطراب
آزادیوں کی سچی مسرت چمن میں تھی

سامان سب تھے آج خدا نے بنا لیا
توبہ کے بعد کچھ مری نیت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے دیکھ کے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاض کی تربت چمن میں تھی

(۸۷) مضطر ۱۸۶۵ء

مضطر خیرآبادی۔ سید افتخار حسین ولد مولانا سید حافظ احمد حسین رضوی ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش لفظ "افتخار" سے نکلتی ہی۔ آپ شمس العلماء مولانا محمد عبد الحق صاحب منطقی کے حقیقی بھانجے ہیں عربی۔ فارسی کی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی جو اپنے زمانے کی لائق ادیبہ تھیں فن شعر میں حضرت امیر مینائی سے تلمذ ہی۔ طبیعت حاضر پائی ہے۔ بہت زود گو ہیں نواب صاحب ٹونک کے استاد ہیں افتخار الشعرا کا خطاب حاصل ہی۔ اب ریاست گوالیار میں ملازم ہیں ایک دیوان "نذر خدا" جو توحید میں ہی چھپ گیا ہی ۶۳ سال کی عمر میں ۱۷ رمضان ۱۳۴۵ھ کو انتقال ہو گیا۔ قلعہ گوالیار کے پہلو میں مزار جھینگا شاہ کے قریب دفن ہوئے۔

نمونہ کلام یہ ہے :۔

(۲۱۸) غزل

سچ یہ ہی کہ میں کون متاعِ دل و دیں کا
وہ آپ ہی مالک ہیں یہ سب کچھ ہی انھیں کا

چھانا ہی جگر میری دعاؤں نے فلک کا
چھلنا ہی کلیجا مرے نالوں نے زمیں کا

دن رات تمنا ہمیں کچھ کچھ ہی کسی کی
دن رات تصور ہمیں کچھ کچھ ہی کہیں کا

(وہ وصل کی خواہش پہ یہ منہ دیکھ کے بولے
لکھا تو مٹا ڈالی خطِ لوحِ جبیں کا

کھویا مرے جینے کا مزہ موت نے مضطر
اللہ کرے صبر پڑے جانِ حزیں کا

(۸۸) جلیل ۱۸۶۹ء

جلیل۔ حافظ جلیل حسن ابن مولوی حافظ عبدالکریم صاحب مانک پور ضلع الٰہ آباد کے رہنے والے اکیاسی سال کے قریب عمر ہے۔ سال ولادت تقریباً ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ ہجری بیس سال کی عمر میں حضرت امیر مینائی کے بمقام رام پور شاگرد ہوئے تمام و کمال فیض انھیں سے حاصل کیا۔ اب ان کے جانشین کہلاتے ہیں۔ امیر اللغات کے دفتر میں عرصہ تک سکریٹری رہ چکے ہیں۔ حیدرآباد میں بھی منشی صاحب کے ہمراہ تھے اسوقت سرکار نظام کے سلسلۂ ملازمت میں داخل ہیں۔ نواب فصاحت جنگ کے خطاب سے سرفراز ہیں۔ دو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

(۲۱۹) غزل

حسن و الفت ہیں خدا نے ایک پیدا کر دیا | درد دل مجھ کو دیا۔ تم کو مسیحا کر دیا
خوبیوں کی تقسیم تو نے اے خیال زلف یار | دل کو نذر داغ۔ سر کو وقف سودا کر دیا
جان لے لینا جلانا کھیل ہے معشوق کا | آنکھ سے مارا لب نازک سے زندہ کر دیا
مجھ کو شکوہ ہے کہ دل کا خون قاتل نے کیا | دل یہ کہتا ہے مجھے قطرے سے دریا کر دیا
ناز ہو یا دلبری افسوں ہو یا جادو گری | سب کو قدرت نے تری چتون کا حصہ کر دیا

دل ادھر رخصت ہوا ہوش ادھر رخصت چلتے ہوئے
میں کہاں لطف کہاں یہ سب کچھ شرمے رکھے ہیں
مرحبا اے ساقیِ جادو نظر صد مرحبا
کیا نہ ایسا جانتا تھا تیری چشم شوخ کو

کس کی آنکھوں نے یہ درپردہ اشارہ کر دیا
تم پہ خود شیدا ہوا مجھ کو بھی شیدا کر دیا
مست آنکھوں نے مرا نشہ دوبالا کر دیا
فتنے برپا کرتے کرتے حشر برپا کر دیا

دل تڑپتا ہے تو کچھ تسکین ہوتی ہے جلیلؔ
جی بہلنے کو خدا نے درد پیدا کر دیا

(۲۲۰)

دردِ دل کہہ کے ان پہ اثر کچھ بھی نہیں
دیکھنے کو تو سبھی رکھتے ہیں آنکھیں لیکن
کیا محبت وہی ذرہ دل میں ہوا کرتی ہے
شمع اٹھا کے محفل میں گھلی جاتی ہے
بھیگی دیدۂ گریاں کی گہرافشانی
آپ کی اک شبِ فرقت ہے قیامت سو بار
یاس ہوتی تمہ سے ملنے سے تو بہتر ہوتا

دل میں رہتے ہیں مگر دل کی خبر کچھ بھی نہیں
تو نظر آئے نہ جسکو وہ نظر کچھ بھی نہیں
اس طرف جان پہ آفت ہے ادھر کچھ بھی نہیں
رات بھر کا ہے سماں وقتِ سحر کچھ بھی نہیں
ہے جو دامن میں بجز لختِ جگر کچھ بھی نہیں
اور ابھی خیر سے آثارِ سحر کچھ بھی نہیں
نخلِ امید سے امیدِ ثمر کچھ بھی نہیں

کوئے جاناں میں یہ جانے کا نتیجہ ہے جلیلؔ
کھو گئے ہوش کچھ ایسے کہ خبر کچھ بھی نہیں

(۵۹) اقبال ۱۸۷۶ء

اقبال۔ شیخ محمد اقبال ایم۔اے ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ میں اپنے وطن سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ طرز جدید کے شعرا میں نامور ہیں۔ فارسی میں اعلیٰ درجہ کی استعداد رکھتے ہیں عربی اور سنسکرت میں بھی کسی قدر دخل ہے۔ انگریزی میں ایم۔اے پاس ہیں۔ تعلیم انگلستان اور جرمنی میں پائی۔ آپ کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی مل چکی ہے۔ لاہور میں بیرسٹر ایٹ لا ہیں۔ شاعری کا شغل بھی جاری رہتا ہے۔ علوِ تخیل اور پرواز فکر ان کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہے۔ ان کا کلام رموزِ فطرت اور مناظر قدرت سے ان کی محبت کا پتا دیتا ہے۔ ان کا یہ ترانہ ملک بھر میں مشہور ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو سر کا خطاب بھی مل گیا ہے۔ (۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال ہوا) نمونہ کلام یہ ہے:-

(۲۲۱) ترانہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں وطن ہے سارا جہاں ہمارا
دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا — ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں — خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — ممکن نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم — سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہی ہم کو
اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
سالارِ کارواں ہی میرِ حجاز اپنا

ہی خوں تری رگوں میں ابتک رواں ہمارا
تھمتا نہ کسی سے سیلِ رواں ہمارا
اب تک ہی تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
اس نام سے ہی باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہی گویا
ہوتا ہی جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

(۲۲۲)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہم اگر ہوں رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ جہاں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(۲۲۳)

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
تجھے کیا بتائیں ہم نشیں ہمیں موت میں جو مزا ملا
نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاطِ عمرِ دراز میں
نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

زمانہ آیا ہی بے حجابی کا وصلِ دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
نہیں رہا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
جہان سارا بنے گا میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا۔ کاروان مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا
چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہی داغ اپنا کلی کلی کو
وہ یہ سمجھتا ہی اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہی اس کی
کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

(۲۲۵)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا۔ نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری
میں نوائے سوختہ در گلو۔ تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو۔ تو حدیثِ ماتمِ دلبری

مرا عیشِ غم ۔ مرا شہدِ سم ۔ مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم ۔ گروِ عجم ۔ ترا دین خریدۂ کافری

تری راکھ میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

شکوہ (۲۲۹)

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سُن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم

پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
بوئے گُل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمّت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر

کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی

اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں

خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی

کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کیلئے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے
قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہدے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے
کاٹ کر رکھدیئے کفار کے لشکر کس نے
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایران کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزدان کو

کونسی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی
و تیرے لیئے زحمت کشِ پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی
کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟
کسکی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ہو اللہ احد کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

اُمتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مئے پندار بھی ہیں
اُن میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے

منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

یہ شکایت نہیں ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے؟ کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعنِ اغیار ہے۔ رسوائی ہے ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے

دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلا لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لیکر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر

دردِ لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی
اُمتِ احمدِ مرسل بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیِ غیرِ سبب کیا معنی ؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی !

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا
بُت گری پیشہ کیا بُت شکنی کو چھوڑا
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
رسمِ سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے
اک اشارے میں ہزاروں کے لیئے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمیِ رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں ؟

ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں ؟

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا
گھر یہ اُجڑا ہی کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

ای خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے

پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہی پھر سوئے حجاز
لے اُڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہی بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہی ساز

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہی اسی آگ میں جلنے کے لیے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشترکدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہی کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہی کہ ہی محوِ ترنم اب تک
اُس کے سینے میں ہی نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہی باقی نہ مزہ جینے میں
کچھ مزہ ہی تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خم ہی تو کیا، مے تو حجازی ہی مری
نغمہ ہندی ہی تو کیا، لے تو حجازی ہی مری

(۲۲۷) پرندے کی فریاد
بچوں کے لیے

آتا ہی یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہی چوٹ دل پر آتا ہی یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہی کہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہی یہ حال ہو گیا ہی
دل غم کو کھا رہا ہی غم دل کو کھا رہا ہی

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہی

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

(۲۲۸) ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دُنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گُل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بُلبُل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کُہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گُل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سُرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو۔ نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

(۲۲۹) سید کی لوحِ تربت

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہی اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہی اسیر

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ

فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہی یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہی یہی

سنگِ تربت ہی مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہی تعلیم دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہی بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ

رنگ پہ جو اب نہیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا

عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثال جام جم

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

(۲۳) چاند

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن
قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شاید ہوا رنج رہ منزل سے تو
آفرینش میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے
ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہی
زندگی کی رہ میں سرگرداں ہی تو، حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہی، سوزاں ہوں میں
میں رہِ منزل میں ہوں، تو بھی رہِ منزل میں ہو
تیری محفل میں جو خاموشی ہی میرے دل میں ہی
تو طلب خو ہے، تو میرا بھی یہی دستور ہی
چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا لو ہی
انجمن ہی ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہی تو تنہا ہوں میں
مہر کا پرتو ترے حق میں ہی پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل
پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہی
درد جس پہلو میں اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہی

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو
سکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

(۲۴۳) پیامِ عشق

سُن اے طلبگارِ دردِ پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا
نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو، ادا مثالِ نماز ہو جا
نہ ہو قناعت شعار گلچیں، اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا
گئے وہ ایام، اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمعِ سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا

وجودِ افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو مِلّت پہ یعنی، آتش زن طلسمِ مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

(۲۳۲) غزل

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اُٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا
جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قایم ہے شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا
نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جو کا
کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے! نگار خانہ ہے آرزو کا
کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسمِ ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسمِ خاکی، غبار تھا کوئے آرزو کا
اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بیدرد کیوں ہے انساں
تری نگاہوں میں ہے تبسّم شکستہ ہونا مرے سبو کا
ریاض ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا
تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا
سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا
کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا
گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رختِ سفر اُٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا
جو گھر سے اقبال دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثال گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

(۲۳۳) غزل

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گزر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا
سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے رُوما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سُن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
سفینۂ برگِ گُل بنائے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا کے پار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
جو ایک تھا اے نگاہ! تونے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا
کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
یہ رسم بزم فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبش نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
میں ظلمت شب میں لیکے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا
نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا

نہ پوچھو اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سر رہ گزار بیٹھا ستم کش انتظار ہوگا

(۲۳۴) فلسفۂ غم

(میاں فضل حسین صاحب بیرسٹرایٹ لا لاہور کے نام)

گو سراپا کیفِ عشرت ہی شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہی دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہی حبابِ زندگی
ہی الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہی دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہی
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہی

حادثاتِ غم سے ہی انسان کی فطرت کو کمال
غازہ ہی آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہی لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہی اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہی
راز ہی انسان کا دل، غم انکشافِ راز ہی

غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہی
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہی

شام جس کی آشنائے نالۂ "یارب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں

جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہی نا آشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہی محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہی ہجر کے آزار سے

کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے ۔۔۔ زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

ہے کہ نظمِ دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق ۔۔۔ عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے ۔۔۔ عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے
رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر ۔۔۔ جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں ۔۔۔ روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی ۔۔۔ آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئنہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور ۔۔۔ گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے ۔۔۔ یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی ۔۔۔ مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے ۔۔۔ دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی ۔۔۔ گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامن دل بن گیا ہو رزم گاہ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خنجر ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آواز ضمیر

وادی ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(۲۲۵) خطاب بہ جوانان اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاج سر دارا

تمدن آفریں خلاق آئین جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں الفقر فخری کا رہا شان امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

"غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را"

(۲۳۶) فاطمہ بنت عبداللہ

عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر!
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر!
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی!
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہی کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہی ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ انکی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں انکی اس مرقد سے میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہی ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہی جنکی موجِ نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جنکی ضو نا آشنا ہی قیدِ صبح و شام سے

جنکی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہی
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہی

(۲۳۷) والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہی
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہی

آسماں مجبور ہی شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہی شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہی اسی زنجیرِ عالمگیر میں ہر شے اسیر

آنکھ پر ہوتا ہی جب یہ سرِ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہی دل میں اشک کا سیلِ رواں

قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہی، لطفِ زیر و بم رہتا نہیں

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہی
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہی

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں

جانتا ہوں آہ! میں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز

میرے لب پر قصۂ نیرنگیِ دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن میرا
گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن میرا

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا
عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

وہ جواں قامت میں ہی جو صورت سرو بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبار زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا

تجھ کو مثل طفلک بے دست و پا روتا ہی وہ
صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہی وہ

تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر!
آدمی ہی کس طلسم دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہی، کسقدر آساں ہی موت!
گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہی موت

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت

موت ہی ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

نے مجال شکوہ ہی، نے طاقت گفتار ہی
زندگانی کیا ہی، اک طوق گلو افشار ہی

قافلے میں غیر فریاد درا کچھ بھی نہیں
اک متاع دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پس نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا

جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہی آہِ خزاں
سبز کر دے گی انھیں بادِ بہارِ جاوداں

خفتہ خاکِ پے سپر میں ہی شرار اپنا تو کیا
عارضی محمل ہی یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہی
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہی

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

ہی اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جسطرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ! غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہی
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہی

جنتِ نظارہ ہی نقشِ ہوا بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہی حباب

موج کے دامن میں پھر اسکو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہی یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آہ! سیمابِ پریشاں، انجمِ گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں ممنونِ شب ہی جن کا سوز

عقل جس سے سر بزانو ہی وہ مدت انکی ہی
سرگزشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہی

پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہی جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثالِ شمع روشن محفلِ قدرت میں ہی
آسماں اک نقطہ جسکی وسعتِ فطرت میں ہی
جسکی نادانی صداقت کے لئے بیتاب ہی
جسکا ناخن سازِ ہستی کے لئے مضراب ہی

شعلہ یہ کمتر ہی گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہی آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہی
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہی
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہی
خود نمائی، خود فزائی کے لئے مجبور ہی
سردیِ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہی یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہی یہ!
ہی لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہی گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہی
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہی

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

کہتے ہیں اہلِ جہاں دردِ اجل ہی لادوا
زخمِ فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہی شفا
دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہی
حلقۂ زنجیرِ صبح و شام سے آزاد ہی
وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں
سر پہ آجاتی ہی جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں

رابطہ ہو جاتا ہی دل کو نالہ و فریاد سے
خون دل بہتا ہی آنکھوں کے نہر شک آباد سے

آدمی تاب شکیبائی سے گر محروم ہے
اس کی فطرت میں اک احساس نامعلوم ہی

ق

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہی، فنا ہوتا نہیں

رخصت ہستی خاک غم کی شعلہ افشانی سے ہی
سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہی

آہ یہ ضبطِ فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہی یہ دل آسائی، فراموشی نہیں

پردہ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہی صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہی صبح

لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہی یہ
بے زباں طائر کو مستِ نوا کرتی ہے صبح

سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہی
سیکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہی

خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروس زندگی سے ہم کنار

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

دام سیمینِ تخیل ہے مرا آفاق گیر
کر لیا ہی جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہی
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

وہ فرائض کا تسلسل نام ہی جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہان بے ثبات

مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہی
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہی

ہی وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے
ساز گار آب و ہوا تخم عمل کے واسطے

نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں	تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر	خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا	نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(۹۰) ناظر ۱۸۷۲ء

چودھری خوشی محمد خاں بہادر خلف چودھری مولی داد خاں - ہریاوالا ضلع گجرانوالہ کے باشندے ہیں سال پیدائش تقریباً ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ ہے ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ کالج سے بی-اے پاس کیا. زمانہ طالب علمی سے شعر گوئی کا شوق تھا. فن سخن میں خواجہ حالی مرحوم کے شاگرد ہیں. ریاست کشمیر میں عہدۂ گورنری پر مامور رہیں. غزل گو نہیں ہیں صرف حالیہ نظمیں لکھتے ہیں جو علوِ خیال کے لحاظ سے پسند کی جاتی ہیں.

نمونہ کلام یہ ہے:-

(۲۳۸) جوگی

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

مستانہ ہوائے گلشن تھی ۔ جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیِ ایمن تھی ۔ ہر کوہ پہ جلوۂ طور رہا

جب بادِ صبا مضراب بنی ۔ ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ۔ ہر سروِ چمن طنبور بنا

سب طائر مل کر گانے لگے ۔ عرفاں کی تانیں اُڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے ۔ عرفاں کی تانیں اُڑانے لگے

سبزے پہ بساط بچھائی تھی ۔ اور بزمِ سرود سجائی تھی
بن میں گلشن میں، آنگن میں، فرشِ سنجاب و سمور ہوا

تھا دلکش منظرِ دشت و جبل ۔ اور چالِ صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرؔ سا دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے ۔ پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی

یاں برف کے تودے گلتے تھے ۔ چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے ۔ نالوں نے دھوم مچائی تھی

یاں قلۂ کوہ پہ رہتا تھا ۔ اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹاؤں میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمائی تھی

تھا راکھ کا جوگی کا بستر۔ اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیبِ کمر۔ جو گھٹنوں تک تک لٹکائی تھی
سب خلقِ خدا سے بیگانہ۔ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ۔ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اُٹھا کر ناظر سے۔ یوں بن باسی نے کلام کیا

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آکر ستاتے ہو
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آکے پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا۔ کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا۔ تم ہم کو سنانے آتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے۔ اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے۔ تم لاکے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی۔ ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی۔ تم اُس کو آکے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے۔ من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑائی پیتم سے۔ تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

اُس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی۔ مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو۔ چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں۔ پربت میں کیا ہی ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں، کیا مندر میں، سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں، نگر میں، ساگر میں، ہر اترا ہے ہر جا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے، واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساغر چلتا ہے، چل کے دل بہلا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے۔ ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی۔ بازار میں دھونی رما جوگی

ان چکنی چپڑی باتوں سے مست جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے۔ پھر اس پہ نہ تیل گرا بابا
ہے شہروں میں غل شور بہت۔ اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت۔ سادھو کی ہے بن میں جا بابا

ہو شہروں میں شورش نفسانی جنگل میں ہو جلوۂ نورانی
ہو نگری ڈگری کثرت کی - بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں - پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پر آکاس کا منڈل ہے - دھرتی پہ سہانی مخمل ہو
دن کو سورج کی محفل ہو - شب کو تاروں کی سبھا بابا
جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں - گاتی ہے ملار ہوا بابا
یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں - پیتم کے سندیش سناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں - پھل پھول اور گیا بابا
ہو پیٹ کا ہر دم دھیان تمھیں - اور یاد نہیں بھگوان تمھیں
سِل پتھر - اینٹ - مکان تمھیں - دیتے ہیں سکھ سے چھڑا بابا
تن من دھن ہیں گاتے ہو - پیتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لال گنواتے ہو - تم بندۂ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہو یہ دنیا رام کہانی ہو
یہ عالم - عالم فانی ہے - باقی ہے ذاتِ خدا بابا

(۹۱) نظامی بدایونی سنہ ۱۸۷۲ء

نظامی۔ نظام الدین حسین ولد منشی فخرالدین ساکن بدایوں سنہ ۱۲۸۹ھ مطابق سنہ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ ابتدائے سنِ شعور سے شعر و سخن سے ذوق ہے۔ شاعری میں سب سے پہلے حضرت مجید بدایونی مرحوم سے استفادہ حاصل کیا۔ اسکے بعد حضرت حالی سے اصلاح لی۔ زمانۂ طالبعلمی سے مضمون نگاری کا شوق تھا۔ بعض اخبارات کو قلمی مدد دیتے رہے۔ ہمیشہ علی گڑھ کالج اور قومی تعلیم کے مسئلہ پر خامہ فرسائی کی سنہ ۱۹۰۲ء میں بدایوں سے اخبار ذوالقرنین نکالا جو اس وقت تک جاری ہے سنہ ۱۹۱۶ء میں کلیات شیفتہ یعنی نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے فارسی و اردو کلام کو ترتیب دیا اور اس پر ایک بسیط مقدمہ لکھا جو حضرت شیفتہ کے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب کے ایما سے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں اردو دیوان غالب کی شرح لکھی اور ایک خوبصورت مجلد نسخہ شائع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ ایک کتاب "قاموس المشاہیر" جسمیں مشرقی مشاہیر کے مختصر حالات بہ ترتیب حروف تہجی دیئے گئے ہیں مرتب کی ہے اس کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے دوسرا زیر طبع ہے۔ انتخاب زریں کے دوسرے ایڈیشن کے بعد دوسرا حصہ بھی شائع ہو گیا صرف قومی نظمیں جو واقعات اور جذبات کا مرقع ہوتی ہیں لکھتے ہیں آپکی مختلف نظموں کا ایک مجموعہ تجلیات سخن کے نام سے شائع ہو گیا۔ جون سنہ ۱۹۳۹ء میں بدایوں ہی میں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:۔

عرضداشت منظوم بہ پیشگاہِ خسروِ دکن خلد اللہ ملکہ بہ امید قبولیت قاموس المشاہیر

(۲۳۹)

منبعِ فیض و کرم ہی بارگاہِ خسروی
مطلعِ مہرِ سعادت رونقِ کاشانہ ہی

جسطرف دیکھو دکن کی روشنی ہی جلوہ گر
شمع ہی حسنِ ریاست اک جہاں پروانہ ہی

صاحبِ اقبال آصفجاہ سلطانِ دکن
طالعِ روشن پہ صدقے حشمتِ شاہانہ ہی

ناخنِ تدبیر سے ہی عقدۂ دشوار وا
ناز ہی اس پر فراست کو کہ وہ فرزانہ ہی

دبدبہ ہی نوشیرواں کا دنگ ہی کسریٰ کی عقل
بارگاہِ عدل ہے یا اک تجلی خانہ ہی

تشنۂ علم و ادب سے جیتے ہیں سب اہلِ بزم
ساقیِ عالی ہمم کے ہاتھ میں پیمانہ ہی

فکر ہی ہر دم کہ اُردو کا رہے ساغر رواں
علم و فن میں ہو ترقی ذکر یہ روزانہ ہی

ہو قبولِ شاہ یہ قاموس اُردو کیا عجب
دفترِ تاریخ ہی، اسلاف کا افسانہ ہی

ای نظامی کیوں نہ ہو تو موردِ لطفِ نظام
پائے نسبت تیرے حق میں جود کا پروانہ ہی

(۲۴۰) اسلام اور حکومتِ الٰہی کی بنیاد

یہ دہر میں ہی تقاضائے گردشِ ایام
نمودِ صبح سے ہو جلوہ ریز رحمتِ عام

شعاعِ حسن سے خلوت نشیں ہو لیلیِ شب
طلوعِ مہر سے ہو پردہ پوشِ ماہِ تمام

ضیائے نور سے ہو محو تابشِ انجم — نسیمِ صبح بچھائے سرور و کیف کا دام
نہ ہوں گناہ کے بادل نہ قہر کی ہو گرج — غم کسی کے نہ ہوں شکلِ گیسوئے شب فام
وہ روشنی ہو نہ تاریکیاں رہیں باقی — فروغِ جلوۂ تاباں ہو لمعۂ الہام
چمن چمن کی فضا پہ ہو اک نیا عالم — عرب بہار سے معمور ہو منور شام
خدا کے حکم سے پوری ہوئی دعائے خلیل — زہے نصیب کہ تشریف لائے خیرِ انام
متاعِ لطف کی ارزانیاں ہوئیں کیا کیا — درِ جواد سے محروم کو ملا انعام
رہی نہ اہلِ قبائل میں کشمکش باقی — بنے وہ ایک ہی آقائے نامور کے غلام
ہوئی رسول کو حاصل حکومتِ دارین — بنا حضور کا دربار عدل گاہِ انام
صلاح کار رہیں بے شک زمیں کے وارث — بنا تھا نغمۂ جاوید یہ خدا کا پیام
حریفِ جوشِ عداوت تھی قوتِ اخلاق — کیا جو آپ نے وہ کر سکے نہ رستم و سام
دکھا سکے نہ کماندار تیر اندازی — بہادروں کی ہوئی تیغ اندرونِ نیام
زبانِ پاک سے نکلی صدائے آزادی — رہا قفس نہ گرفتاریاں نہ حلقۂ دام
سیاسیات میں بے مثل آپ کی رائیں — معاملات میں بے لوث آپ کے احکام
صفائے روح تھی وحدت پرستیٔ ملت — بقائے امن تھا آئین و عدل کا انجام
رہے خزانۂ عالم کے مالک و قابض — بنے نہ طالبِ زر پھر بھی شاہِ ذوالاکرام
ہوئے نہ کام و دہن آشنائے لقمۂ تر — کیا نہ خلعتِ شاہانہ زینتِ اندام
نہ فرش ہائے منقش نہ پردہ ہائے حریر — نہ گھر میں کوئی سجاوٹ نہ رونقِ در و بام

بنا دیا ئے عرفاں سے مست عالم کو
کبھی ہوئی نہ تمنائے ساغرِ گلفام

نہ تاج و تخت کی پروا نہ خواہشِ درباں
مگر تھے زیرِ نگیں قوم کے صغار و عظام

ہوئے وہ شیر و شکر ل کے تھے جو نیک سرشت
الگ الگ رہے محبوبِ حق سے نافرجام

دکھائی شانِ حکومت گلیم پوشی میں
نہ تھی نمایش کسریٰ نہ شوکتِ بہرام

غرض حکومتِ ملی کی یہ نہ تھی ہرگز
خدا کے ملک میں قایم ہو خو سرانہ نظام

یہ تھا حضور کی آمد کا مقصدِ اعظم
کہ دیں تمام خدائی کو دعوتِ اسلام

بڑھائے تزکیۂ نفس ذوقِ روحانی
ادب سے کوچۂ اخلاق میں ہوں گرم خرام

دریغ! ہم نے بھلائے اصولِ پیغمبر
فغاں کہ ہوگئے دنیا جہان میں بدنام

جو راہِ صدق میں ملت ہو حوصلہ فرسا
شریعتِ نبوی کھر بنے سبیلِ دوام

یہی ہے نذرِ نظامیؔ یہی ہے ہدیۂ شوق
ہزار بار نبی پر درود اور سلام

(۲۲۱) جامعۂ عثمانیہ

(انتخاب از قصیدہ سال گرہ ہمایوں)

بتا رہا ہے تغیرِ نظامِ عالم کا
کہ علم سے نئے قالب میں ڈھل رہا ہے بشر

یہ علم وہ ہے کہ جو ہے زینتوں کی اک زینت
یہ علم وہ ہے کہ جو ہے زیوروں کا اک زیور

بڑھی ہے علم سے قوموں کی عقل و استعداد
ہوئی ہے غور سے اور فکر سے وسیع نظر

غرض ہے یہ شہِ آصف کی علم کا ہو شیوع
بنائے قوتِ ذہنی کو ہر طرح بہتر

شکستِ رنگِ جہاں سے تیرگی مٹ جائے
ریاضیات کے پرتو سے ذہن ہو روشن
دکن میں جامعِ عثمانیہ وہ قائم ہو
زبانِ ملک کو ہوں وہ ترقیاں حاصل
دماغِ قوم ہو روشن شعاعِ علمی سے
وہی علوم دکن میں ہوں جاری و ساری

اِدھر اُدھر ہوں فروزاں چراغ علم و ہنر
الٰہیات کے جلوے سے قلب ہو انوار
دکن ہو مصر تو جامع ہو جامع ازہر
رہیں خزینۂ اُردو میں خوشنما گوہر
بنیں مفید کتابیں غذائے روحِ بشر
کسی زمانے میں یونان جن کا تھا مظہر

یہ مُدعا ہے وہی مُدعا جو ہے خوش کن
یہ آرزو ہے وہی آرزو جو ہے خوشتر

(۲۴۲) مناظرِ دولت آباد

ہے صبا سرگرم شوخی مست موجِ آبشار
مظہرِ فطرت تک منزل پہاڑوں کی غذا
دفترِ قدرت کا مجموعہ ہیں پھولوں کے ورق
برف کتنی اُس کی سپیدی سے ہوئی ہے آب آب
کوکتے ہیں ہر طرف صحرا میں طاؤس مست
پر فشانی سے عیاں ہے جادۂ بالِ پری
کیجئے آزاد ہو کر اک نئی ہستی کی سیر

لڑکھڑائے جس طرح نشہ میں کوئی نازنیں
سنگ ریزے گھاٹیوں کے بین کہ ہیں در ثمیں
اور کوسوں تک پہاڑ چھائی ہے سبزے نے زمیں
گھاٹ کی دیوار مضبوطی میں کوہِ آہنیں
رہ نوردوں کو لبھاتی ہے نوائے دلنشیں
ہر طرف پرواز میں مصروف مرغِ دانہ چیں
دل یہ کہتا ہے یہیں ہو جائیے خلوت گزیں

دو پہاڑوں کی ہم آغوشی ہی کتنی دلربا	حوضِ قتلو بھی یہیں ہی اور دریا بھی یہیں

(۲۲۳) خلد آباد میں غارِ ایلورہ

غار ایلورہ عجب شے ہی دکن کے ملک میں	جسکی صنعت تصدق ہی نگارستانِ چین
عہدِ گوتم کے صنم خانے بنے ہیں اندرونِ کوہ	دستکاری دیکھکر حیران ہیں نظارہ بیں
ایک جانب موجزن ہی آبشارِ خوش نما	ہی وہ ستّر گز کی بلندی سے رواں سوئے زمیں
دیکھنے والی نظر کو ہو رہا ہی یہ گماں	سطحِ ارضی پر ہی بہتا چشمۂ خلد بریں
بت تراشی کے نمونے گھاٹیوں کی تہہ میں ہیں	صنعتِ مغرب بھی ہی انکے مقابل شرمگیں
کہہ رہی ہیں غار کی سنگیں عماراتِ عجیب	کیا ہوئی وہ شان و شوکت کیا ہوئے اپنے مکیں

(۹۲) احسن ۱۸۷۵ء

احسن۔ سید حافظ علی احسن خلف حاجی سید مجتبیٰ احسن مرحوم قصبۂ مارہرہ ضلع ایٹہ کے پیرزادوں میں ہیں شوال ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ کم سنی سے شاعری کا شوق ہی حضرت داغ کے مشہور تلامذہ میں ہیں۔ فارسی میں خاص مہارت ہی عربی میں بھی دخل ہی۔ رسالہ فصیح الملک آپ کی ادارت میں جاری تھا۔ آجکل مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں لکچرار ہیں (۳۰ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کو انتقال ہو گیا) نمونۂ کلام حسب ذیل ہی:۔

غزل (۲۴۳)

دنیا کا بھروسہ نہ سہارا مجھے دیں کا
اس عشق بدانجام نے رکھا نہ کہیں کا

قسمت میں جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا
لکھا ہوا مٹتا ہے کہیں لوحِ جبیں کا

تم نالۂ مظلوم کو بیکار نہ سمجھو
پایا نہ ہلا دے وہ کہیں عرشِ بریں کا

ایسوں کو ستانا نہیں اچھا نہیں اچھا
لے صبر نہ اے چرخ کسی گوشہ نشیں کا

احسن کی تسلی تو ذرا کیجیے آکر!
اب آ ہی گیا وقت دمِ بازپسیں کا

(۲۴۴)

بنی ہے دم پہ تو ایسا خیال ہوتا ہے
وگرنہ ترکِ تعلق محال ہوتا ہے

جما ہوا ہے تصور کچھ اس طرح دل میں
کہ خواب میں بھی اسی کا خیال ہوتا ہے

عتاب میں نہیں رہتی نقاب چہرے پر
عیاں جلال میں ان کا جمال ہوتا ہے

صفِ نیاز میں ہوتا ہے سر بلند وہی
تمھارے ہاتھ سے جو پائمال ہوتا ہے

ترے ستم پہ یہ ہوتا ہے دل کہ قطع کروں
مگر پھر اپنے کیے کا خیال ہوتا ہے

امید صلح نہ رکھ بدمزاج سے احسن
کہ اس سے میل کے بدلے ملال ہوتا ہے

(۲۴۵)

سنگِ در بنکر بھی کیا حسرت مرے دل میں نہیں
ترے قدموں میں ہوں لیکن تری محفل میں نہیں

اُن کی بزمِ ناز کیا ہے عالمِ تصویر ہے
راہِ الفت کا نشاں یہ ہے کہ ہے وہ بے نشاں
بزم آرائی سے پہلے دیکھ او نادان دیکھ!
رہ گئے زنداں میں کرینگے ہم کھلے بندوں فغاں
ہو چکی مشقِ ستم بس او ستم ایجاد بس!

ہے یہ خاموشی کہ گویا کوئی محفل میں نہیں
جادہ کیسا نقشِ پا تک کوئی منزل میں نہیں
کون ہے محفل میں تیری کون محفل میں نہیں
پاؤں ہے زنجیر میں لب تو سلاسل میں نہیں
اب تڑپنے کی سکت بھی تیرے بسمل میں نہیں

پوچھتا ہے آرزو حسرتؔ تو کیا بار بار
تیرے ملنے کے سوا کوئی ہوس دل میں نہیں

(۹۳) حسرتؔ ۱۸۷۵ء

حسرتؔ ۔ مولانا فضل الحسن۔ خلف سید اظہر حسن صاحب۔ موہان ضلع اناؤ کے باشندے ہیں۔ سال پیدائش غالباً ۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۲ھ ہے۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی سے سخن گوئی کا شوق ہے۔ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ان کا شمار بڑے بڑے شعرا میں ہے۔ اردوئے معلیٰ نامی ماہوار رسالہ کے ذریعے عرصہ تک زبان اردو کی خدمت کی۔ چار دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ دیوان غالب اُردو کی شرح بھی لکھی ہے۔ ایک تذکرۃ الشعرا لکھنا شروع کیا تھا جس کے صرف چند حصے شائع ہو کر رہ گئے۔ عرصہ سے ان کے ادبی شوق پر سیاسی خیالات غالب ہیں۔ اسوقت تک ان کا دیوان دس حصوں میں

شائع ہو چکا ہے) نمونۂ کلام یہ ہے: (افسوس ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو انتقال ہو گیا)

(۲۴۶) غزل[1]

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

دل بس کہ ہے دیوانہ اس حسنِ گلابی کا
رنگیں ہے اسی روسے شاید غمِ فرقت بھی

خود عشق کی بیتابی سب تجھ کو سکھائے گی
اے حسنِ حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی

رکھتے ہیں مرے دل پر کیوں تہمتِ بیتابی
یاں نالۂ مضطر کی جب مجھ میں ہو قوت بھی

ہیں شاد و صفی شاعر یا شوق و وفا حسرتؔ
پھر ضامن و محشر ہیں اقبال بھی وحشت بھی

(۲۴۷)

ہمائے یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہو
یہ رنگیں ماجرائے عشقِ شیریں کار پیدا ہو

ترے روئے دل آرا کے تصور کا یہ عالم تھا
کہ چشمِ شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہو

مرے اسرارِ مضطر تھا نہاں تھی میری ناموسی
غربت اثر آسماں سے تو اخبار بھی پیدا ہو

(۱) [illegible] ہمیشہ بھی گوئی [illegible]

طریقِ عشقِ جاناں ہے جدا گبر و مسلماں کا
یہیں سے اختلافِ سبحہ و زنار پیدا ہے
نگاہِ آرزو گلچیں باغِ کامرانی ہے
بنانِ خوابِ شکر، طالعِ بیدار پیدا ہے
وفا پیدا بہ شکلِ بے زبانی آشکارا تھی
ستم تیرا بہ رنگِ پرسشِ اغیار پیدا ہے
نسیمِ دہلوی کی پیروی آساں نہیں حسرت
تجھی سے ہو کہ یہ نیرنگیِ گفتار پیدا ہے

(۹۴) فانی ۱۸۷۹ء

مولوی شوکت علی خاں بی۔ اے۔ ال ال۔ بی بدایونی۔ پیدایش ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء بریلی کالج کے گریجویٹ ہیں ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ کالج سے ایل۔ ایل بی ہوئے کئی سال تک لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے آجکل بریلی میں قیام ہے۔ آپ کا کلام علیگڈھ کالج میگزین اور دیگر ماہوار رسالوں میں اکثر چھپتا رہتا ہے۔ ایک مختصر دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اب حیدرآباد دکن میں انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں ان کا دیوان کچھ غزلوں کے اضافہ کے ساتھ دوبارہ شائع ہو چکا ہے (۱۹۴۱ء میں انتقال ہو گیا) نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

(۲۴۹)

مری میت پہ اُنکا طرزِ ماتم کس بلا کا ہے
دل بے مدعا سے پوچھتے ہیں مدعا

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارا ہے بہہ جائے تو

مری محرومیوں کا فیض جاری ہو گئے پے میں
بدن میں جو لہو کی بوند ہے خونِ

غبارِ اشکِ خارستانِ حسرت یاس کے منظر
ہمارے دل کی دُنیا بھی کوئی دُنیا ہے

نظر آتے ہیں دل میں آج پھر آثارِ بینائی
ہم اپنے اُمید قبلہ اس میں کچھ تیرا اش

شبِ فرقت میں ہم ہر سانس میں یہ پوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہے مزاج دل تو ا

یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے

(۹۵) چکبست سنہ ۱۸۸۲ء

چکبست[۱]. برج نرائن کشمیری پنڈت ہیں۔ ۱۸۸۲ء مطابق ۱۳۰۰ھ میں بر
فیض آباد پیدا ہوئے۔ وطن لکھنؤ ہے کیننگ کالج لکھنؤ میں بی۔ اے پاس کر کے ال ال
کی ڈگری حاصل کی لکھنؤ میں وکالت کرتے ہیں۔ شاعری میں حضرت افضل سے تلمذ
رنگ قدیم و جدید دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں ناظم و ناثر ہیں۔ ان کی نظموں
مجموعہ صبح وطن کے نام سے ۱۹۱۸ء میں شایع ہوا ہے۔ آجکل ایک اُردو رسالہ صبح امید

(۱) افسوس کہ قبل طبع ثانی تذکرہ ہذا چکبست صاحب کا تاریخ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء انتقال ہو

لکھنؤ سے نکالتے ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہی:-

(۲۴۹) غزل

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

اجل کی نیند میں بھی خواب ہستی گر نظر آیا
تو پھر بیکار ہی تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا

چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

وہ سودا زندگی کا ہی کہ غم انسان سہتا ہی
نہیں تو ہی بہت آسان اس جینے سے مر جانا

وہ طبع یاس پرور نے مجھے چشم حقیقت دی
کہ شام غم کی تاریکی کو بھی نور سحر جانا

(۲۵۰) رامائن کا ایک سین

رخصت ہوا وہ[1] باپ سے لیکر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزل اول ہوئی تمام

منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام

آخر ہی کچھ حدِ ستم و ظلم و جور بھی
ہم کو اداس دیکھ کے غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوش خصال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال

دیکھا تو ایک در میں ہی بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہی یہ ہی شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہی
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہی

[1] وہ کا اشارہ رامچندر جی کی طرف ہی۔

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری اک سرد آہ

نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا

افسانۂ ستمزدۂ رنج و محن
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن

دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں

میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
لیکن میرا اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنائے راج دُلارے کو بھیج دوں

دُنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید
انجام کیا ہے کوئی نہیں جانتا یہ بھید

اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی اُمید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید

لکھی ہے کیا حیاتِ ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم

ڈسنا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
بن جوگن ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن مصیبتوں میں گزارے ہیں ماہ و سال
دیکھی تمھاری شکل جب اے میرے نونہال
لائے دلہن جو بیاہ کے شادی ہوئی کمال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے کئی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر
یہ جانے صبر کرتی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سنکر: اُس نے ماں کی یہ فریاد درد خیز
اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جاں سے ہمیں گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
ہوتا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سربسر
کیا جانے کیا ہے پردہ قدرت میں جلوہ گر

خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج، خوشی ہو کہ انتشار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار

سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہوگئے خراب
جن سے کہ بیگناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب

کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے

وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی
دامن پہ جن کے گرد کبھی اڑ کر نہیں پڑی
قائم تھیں جن کے دم سے تمنائیں بڑی بڑی
ماری نہ تھی کبھی خواب میں جن کو پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گل ہوئے رنگ حیات سے
اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہاتھ سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ہوگا بپا کی ان کا گزرتے ہی ماہ و سال
ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
خود دل سے ہو درد جگر کا ملنا کیا بحال

ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
یہ جانتے نہیں کہ وہ ہے دانائے روزگار

انساں اسی کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام

اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں

ہر دن کی دھوپ رات کی شبنم اُٹھا کے گر...
وہ گل ہزاروں پردوں میں جاتے ہیں رائیگا...

رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جان کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن وہ پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار

موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہا...
وہ ابر و برف و باد میں رہتے ہیں برقرا...

ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر

صحرا چمن بنے وہ ہے مہرباں اگ...
رہنا نہیں وہ حال سے بے ...

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

(۹۶) عزیز ۱۸۸۲ء

عزیز، مرزا محمد ہادی۔ ابن مرزا محمد علی صاحب شرفائے لکھنؤ سے ہیں۔ ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی میں ذی استعداد ہیں

امین آباد ہائی اسکول میں مدرس ہیں۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں آپ کا کلام حقیقی جذبات کا معیار ہے۔ علاوہ اور تصانیف کے دیوان اُردو "گل کدہ" کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ افسوس کہ سنہ ۱۳۵۴ھ میں انتقال ہوگیا۔ نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

غزل (۲۵۱)

حبۂ خاک میں اک عالم پنہاں نکلا
دل بھر آیا جو سوئے گورِ غریباں نکلا

قبر تک لاش گئی۔ ساتھ ہوا اک عالم
یوں رہا ہو کے ترا قیدیِ زنداں نکلا

ہاتھ بڑھنا تھا کہ رگ رگ میں لہو دوڑ گیا
پھر وہی مرحلۂ چاکِ گریباں نکلا

وہ جو اس پیکرِ تعمیر کی تھی ویرانی
ذرّے ذرّے میں مرے گھر کے بیاباں نکلا

پردۂ گل سے ہوا فاش جنوں کا پردہ
کون محفل سے تری چاکِ گریباں نکلا

آہ! وہ دل کہ جو تھا معتکفِ استغنا
کوچۂ یار میں منت کشِ درباں نکلا

خودکشی سے کبھی ہوتی کار برآری نہ عزیز
سہل جو کام تھا وہ بھی تو نہ آساں نکلا

(۲۵۲)

حقیقت میں جو سیرِ عالمِ ایجاد کرتے ہیں
وہ ہر ذرّے میں اک دنیا نئی آباد کرتے ہیں

ہمارے ضبط میں پنہاں ہے نظمِ عالمِ ہستی
نہ ہو تم کو یقیں اس کا تو ہم فریاد کرتے ہیں

کوئی دنیا کی قوّت اب مٹا سکتی نہیں تجھ کو
زمینِ دل تجھے اب ہم اس طرح آباد کرتے ہیں

نہ پوچھ اے عشقِ پُرمایہ حقیقت اُن کی ہستی کی
جو اپنے ساتھ اس دُنیا کو بھی آزاد کرتے ہیں

نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے
اسیرانِ محبّت کو وہ آج آزاد کرتے ہیں

بس اب اے روح جلدی اپنے مرکز کی طرف پھر جا
فقط تھا انتظار اس کا وہ کیا ارشاد کرتے ہیں

عدم کے قافلے ہم کو خبر دیتے ہیں آ آ کے
عزیزانِ وطن تم کو عزیز اب یاد کرتے ہیں

(۹۷) مزاج سنہ ۱۸۸۲ء

سید نثار احمد والد کا نام سید قاسم علی پیدائش دوم ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء سید امام جعفر صادق علیہ السّلام کی اولاد سے ہیں سبزوار سے

ہندوستان آئے۔ اس لئے جعفری سبزواری کہلاتے ہیں شاہجہاں بادشاہ دہلی کو انکے مورث سے بادشاہ اس قدر نہایت عقیدت تھی، ۷ مواضعات بطور جاگیر معافی عطا ہوئے ان میں ایک موضع ٹھٹولی تحصیل کاسگنج میں اب تک ان کے خاندان میں باقی ہے۔ اردو میں مزاج فارسی میں احمدی تخلص کرتے ہیں دس سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں حضرت داغ دہلوی سے تلمذ ہے۔ عاشقانہ رنگ کے علاوہ قومی نظمیں بھی لکھتے ہیں وطن علیگڈھ ہے اس وقت سرکار آصفیہ میں بیدر کے تعلقدار اول ہیں۔

(۲۵۳)

خدا کی خدائی میں کیا کیا نہیں ہے
ہمیں کو مگر چشمِ بینا نہیں ہے

مجھے قبر میں کوئی کھٹکا نہیں ہے
کہ یاں جینے مرنے کا جھگڑا نہیں ہے

یہاں عرضِ مطلب کا یارا نہیں ہے
انہیں بات سننی گوارا نہیں ہے

کبھی جو نہ نکلے وہ حسرت ہے میری
جو بر آئے میری تمنا نہیں ہے

تجھے لیکے ہم کیا کریں بادشاہی
ہمیں کو جو دنیا میں رہنا نہیں ہے

کہاں حسنِ صورت کہاں حسنِ معنی
مصور یہ نقشہ وہ نقشا نہیں ہے

مرا درد میری دوا بن چکا ہے
مجھے احتیاجِ مسیحا نہیں ہے

پڑی میکدے پر یہ کیا اوس ساقی
کہ برسوں ہوئے دورِ صہبا نہیں ہے

یہ بیتابیاں رنگ لاکر رہیں گی
مزاج اس کا انجام اچھا نہیں ہے

(۲۵۴)

یہاں تو از گردشِ پیمانہ ہوگئی
اب راہِ مغفرت رہِ میخانہ ہوگئی

پھر چھیڑ کیا یہ اے دلِ دیوانہ ہوگئی
وہ آشنا نگاہ بھی بیگانہ ہوگئی

پھر آگیا ظہور ہوا حسنِ خود پسند
پھر رسم و راہِ آئنہ و شانہ ہوگئی

غرفے سے کس نے جھانک کے ہنگامہ کر دیا
کل کائنات بزمِ حریفانہ ہوگئی

ساقی کی دیکھئے ذرا خمِ مے پہ گر پڑا
زاہد سے بھی یہ حرکتِ رندانہ ہوگئی

جو بات دل سے تا بہ لب آئی نہ تھی کبھی
مجبوریوں سے دل کی وہ افسانہ ہوگئی

اب دل کہاں کہاں خلشِ خارِ آرزو
جاں ہی فدائے جلوۂ جانانہ ہوگئی

ذرّے بھی خاک کے انھیں اب تھمتے نہیں
کسریٰ کی کیا وہ شوکتِ شاہانہ ہوگئی

وحشت نے کھو دیا اثر ہائے ہوش آج
آوارہ سا بھی نعرۂ مستانہ ہوگئی

(۲۵۵)

مری بندگی نے بتا دیا کہ یہ راز ہی ترے ناز ہیں
ترا راز ہی مرے سوز میں مرا سوز ہی ترے ساز میں

نہ الجھ الجھ کے تو بلبل صبا کہیں کھل نہ جائے وہ دل ربا
کہ ہزار دفتر دل کیا بنے ہوئے خم و پیچ زلف دراز میں

کہیں طے ہوں زیست کے مرحلے مجھے مرکے آب بقا ملے
کہ غبار بن کے اڑا کرے مری خاک راہ حجاز میں
وہی نار ہو وہی نور ہو۔ وہی جلوہ گاہ ظہور ہو
وہی شعلۂ سرطور ہو جو نہاں ہو پردۂ راز میں
یہ جہاں ابلہ فریب ہے نہ فراز ہو نہ نشیب ہو
وہی بستیاں ہیں نشیب کی جو بلندیاں ہیں فراز میں
کبھی پردہ در ہوں جلال کا کبھی پردہ دار جمال ہوں
ہیں نہاں ہزار حقیقتیں مرے ایک رنگ مجاز میں

(۹۸) لطف ۱۸۸۲ء

نواب لطف الدولہ بہادر نبیرہ نواب خورشید جاہ بہادر پیدائش ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء اس وقت سرکار آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں صیغہ تعمیرات کے وزیر ہیں۔ نعت اور حمد میں طبع آزمائی فرماتے ہیں نہایت صاف ستھرا اور نکھرا ہوا کلام ہے۔ ملاحظہ ہو:-

(۲۵۶)

ہو نور الٰہی کی تجلی و شگفتگی تم سے	ہو زمیں منور ہو ماہ بدر کی تم سے

ہے باغِ دو عالم کی تم سے چمن آرائی | پہونچی ہے گلوں کو بھی گل پیرہنی تم سے
ہر شے سے ہویدا ہے ہو وجہ وجودِ کل | یہ گلشنِ عالم ہے سرسبز و چمنی تم سے
لولاک لما والے جو کچھ ہو تمہیں تم ہو | اعیان ہوئے ثابت سب خلق بنی تم سے
مقبول کلام اپنا ہو یا اثرِ سارہ کا | سیکھی ہے مگر اس نے شیریں سخنی تم سے
کہتا ہوں غنی کر دو دیدار کی دولت سے | کس چیز کا طالب ہو ز اللہ غنی تم سے

جو نسبتِ روحانی شیخ قرنی کو تھی
طالب ہو اسی کا یہ لطفِ وکنی تم سے

(۲۵۷)

اذیتیں دل کو سب پہونچیں بتوں سے کیا ایک جہاں سے ہم کو
شکایت اپنے نصیب کی ہے گلہ نہیں آسمان سے ہم کو
نہ قول و عہد و قسم سے مطلب غرض نہ نہیں ہے نہ ہاں سے ہم کو
کلام سنتا ہے آج کوئی زبان معجز بیاں سے ہم کو
شکایتیں کیا دلِ دل آنکھیں ہم چھپائیں کیا حال دلکو اُنسے
سکوت سے فائدہ نہ کوئی نہ کچھ ہے حاصل بیاں سے ہم کو
یہ صاف معلوم ہو رہا ہے عدو سے ملنا غلط نہیں ہے
تمہارے انداز گفتگو سے تمہارے طرزِ بیاں سے ہم کو

بھلے سہی غیر ہم نے مانا بھلا کہو تم بلا سے اُن کو
بُرے سہی ہم مگر نہ بولو بُرا تم اپنی زباں سے ہم کو

ٹھنی ہے دل میں کریں گے سودا کسی کی زلفوں سے دل کو دیکر
نہ فائدے سے کوئی خوشی ہے نہ رنج ہے کچھ زیاں سے ہم کو

وہ جانے والے ہیں غیر کے گھر مدد کرا ے شورِ نالۂ دل
جگا نا ہے فتنۂ قیامت کو آج خوابِ گراں سے ہم کو

وفا شعاری و جاں نثاری یہی ہے طرزِ روش ہماری
تمہاری چالیں عدو کی گھاتیں بھلا یہ آئیں کہاں سے ہم کو

کبھی ہے کل کو اور کبھی ہے پرسوں کرو گے حیلے بہانے کب تک
تمہارے دل میں نہیں جو آنا تو صاف کہہ دو زباں سے ہم کو

ازل سے ہے سجدہ گہ ہماری یہیں گذاریں گے عمر ساری
مٹا و خطِ جبیں کو پہلے اُٹھاؤ پھر آستاں سے ہم کو

انھیں کا ہے نام حضرت لطف یہی تو مشہور پارسا ہیں
دکھائی دیتے ہیں دُکدہ میں خموں کے جو درمیاں سے ہم کو

مرنے کے بعد بھی ذرا چین نہ قبر میں ملا
اُس نے مجھے جگا دیا سوئے مزار دیکھ کر

چاک ہو قبائے گل بادِ سحر کی چھیڑ سے
مست ہر ایک نخل ہے جوشِ بہار دیکھ کر

بیم نہیں رجا نہیں، رشک نہیں فغاں نہیں
پھر گیا دل بہشت سے کوچۂ یار دیکھ کر

شورشِ دل نے اے اثر کیا کہوں کیا مزا دیا
اس نے نمک چھڑک دیا سینہ فگار دیکھ کر

(تمام شد)